ندیم کے افسانے

از

احمد ندیم قاسمی

فہرست

نذر

برادرِ بزرگ پیرزادہ محمد بخش صاحب قاسمی

کے نام

جنہوں نے میرے بچپن کی نیم شگفتہ، نیم پژمردہ گھڑیوں، سن بلوغ کے احساس کی آنچ سے تپتے لمحوں اور شباب کی دھڑکتی اور بھڑکتی ساعتوں میں متبسم چہرے اور پُرخلوص ولولے سے میرا ساتھ دیا۔ اور بارہا مجھے نااُمیدی اور تذبذب کے غاروں میں گرنے سے بچایا۔

ندیم

دیباچہ

ہندوستان اپنے دیہاتوں میں رہتا ہے۔ ہندوستان کے شہروں کے مسائل دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کے مسائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اُن میں ایک ایسی ہمواری اور یگانگت پائی جاتی ہے کہ ہر ملک کا افسانہ نویس کم وبیش تھوڑے سے تجربے کے بعد اُن پر قلم اٹھا سکتا ہے لیکن اگر اُس ہندوستان کی تصویر دیکھنا ہو جو دیہاتوں میں بستا ہے تو ایسی تصویر غیر ملکی ادیبوں کے ہاں تو کیا اپنے ہاں بھی بہت کم ملے گی۔ پڑھے لکھے لوگ عموماً شہروں کی پیداوار ہیں اور شہری زندگی ہی سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر یہ بھی نہیں جانتے کہ گیہوں کا پودا کتنا بڑا ہوتا ہے۔ آک کی جھاڑیوں کے پتے کیسے ہوتے ہیں۔ ہل کیسے چلایا جاتا ہے، نلائی کسے کہتے ہیں۔ اِسی لئے تو جب کوئی ایسا

پڑھا لکھا شہری افسانہ نویس دیہات کی زندگی کے متعلق افسانے لکھنے بیٹھتا ہے تو عام طور پر ایسے خاکے تیار کرتا ہے جنہیں ذہنی نفسیاتی اور مقامی اعتبار سے دیہاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اردو زبان میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے متعلق صحیح اور جامع مرقعے سب سے پہلے منشی پریم چند آنجہانی نے ترتیب دیئے اور موجودہ دور میں جن ادیبوں نے دیہات کے موضوع کو نہایت کامیابی سے اپنایا ہے۔ اُس پر ذاتی تجربے، صحیح ادراک، اور ذہنی دیانتداری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اُن میں احمد ندیم قاسمی کا نام پیش پیش ہے۔

احمد ندیم قاسمی اُن معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں۔ جو خود دیہاتی ہیں۔ جن کی حساس افتادِ طبع نے اُنہیں اپنے گرد و پیش کے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے پر مجبور کیا ہے اور جو اب بھی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُن کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ بسر کرتے ہیں جنہیں عام طور پر ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے (گو مجھے اس میں شبہ ہے کہ ہندوستان بیچارے کی کوئی ریڑھ کی ہڈی بھی ہے اور جیسا کہ آپ کو ابھی اِن افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا . . . .) ——

قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کا مقامی رنگ ہے اور وہ بھی کوہستانِ نمک کے دیہاتوں کا مقامی رنگ، کوہستانِ نمک پنجاب کے شمال میں ایک ٹیڑھی بیڑھی سطح مرتفع ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، اپنے دامن میں پتلی پتلی ندیوں اور سرسبز چراگاہوں کو لئے، خوبصورت گاؤں، سرخ یا سپید مٹی سے لپے ہوئے، درخت پھول اور جھاڑیاں تقریباً وہی جو وسطی اور غربی پنجاب میں ہیں یعنی سرینہ، نیم، ببول، بیری اور شیشم، ہاں گھاس زیادہ لمبی اور سبز ہوتی ہے اور بھکڑے کی جھاڑیاں بافراط پائی

جاتی ہیں۔ زبان پوٹھوہاری پنجابی سے ملتی جلتی ہے جس کی شیرینی ضرب المثل ہے کوہستانِ نمک کا سلسلہ ایک طرف تو کشمیر سے جا ملتا ہے اور دوسری طرف صوبہ سرحد سے اسی لئے یہاں کے لوگ خوبصورت بھی ہیں اور غیور بھی، ہندوستانی فوجیوں کی ایک کثیر تعداد اسی علاقہ سے بھرتی کی جاتی ہے۔ اس کی سطح مرتفع اور اس کی ننھی ننھی وادیوں میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے رنگین اور دلآویز افسانے سجائے ہیں۔

لیکن یہ افسانے محض مقامی رنگ کے افسانے نہیں، احمد ندیم قاسمی خالی خولی فوٹوگرافی سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ ایک چابکدست فن کار کی طرح اس مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر اس کے تانے بانے پر دیہاتی زندگی کے جاندار مرقعے تیار کرتے ہیں۔ یہ ایسے مرقعے ہیں جن میں دیہاتی زندگی کو مختلف النوع پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔ دیہاتیوں کی سادہ لوحی اور اُن کی ظالمانہ رسوم پرستی، محبت اور پیٹ کی پکار، بھوک اور عزت کا تضاد، مردوں کی بربریت اور عورتوں کی غلامانہ ذہنیت کوہستانی دوشیزہ کا مثالی حسن، اور پھر اس مثالی حسن کی فروخت چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض، وہ روپہلی ٹکلیاں جن سے لگان ادا ہو سکتا ہے۔ زمین رہن ہونے سے بچ سکتی ہے اور زندگی اپنی تمام تر صعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے کشمکش حیات اپنی بنیادی سچائی کے ساتھ ان افسانوں میں جلوہ گر ہے۔ ان افسانوں میں احمد ندیم قاسمی زندگی سے گریز کرتا نظر نہیں آتا، بلکہ اُسے چھو لینے کے لئے بے قرار دکھائی دیتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا فکری نظریہ ترقی پسند ادیبوں کے بہت قریب ہے لیکن احمد ندیم قاسمی اُن ادیبوں میں سے نہیں۔ جنہوں نے آج تک کسی کسان کا گھر نہیں

دیکھا۔ جو اس کی بولی ٹھولی۔ رسم و رواج اور رہن سہن کے طور طریقوں سے بھی آگاہ نہیں جس کے متعلق اُن کا منبعِ علم، معاشیات کی چند درسی کتابوں یا اپنے رہنماؤں کی جذباتی تقریروں تک محدود ہے اور جو یونہی کبھی کبھی ایک سطحی جوش کے زیرِ اثر کسان کی جبین کے پسینے اور اس کی مظلوم عورت کے سوگوار حسن کے متعلق شاعری کیا کرتے ہیں۔ ایسے ادیب بھی اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں۔ اس لئے کہ وہ ترقی پسند ادب کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فنی صداقت اور شدتِ تاثر کا تعلق ہے احمد ندیم قاسمی کا درجہ ان لوگوں سے بہت بلند ہے اور اُس کے ادبی تجربے ہمارے لئے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی خود ایک کسان ہے۔ اُسے کسانوں کی زندگی سے کماحقہٗ واقفیت ہے۔ اور اس کے فکری شعور میں وہ نفسیاتی تضاد نیم بورژوائی کشمکش اور رجعتی میلانات بہت کم ہیں۔ جن سے متوسط طبقے کے شہری ادیبوں یا اُس سے اونچے طبقے کے ادیبوں کو ترقی پسند ادیب بننے کے لئے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ موخر الذکر ادیبوں کو اکثر اوقات اُن کا آبائی اور معاشری ماحول اور اُن کے جماعتی مفاد کا شعوری یا غیر شعوری احساس ایک تنگ ادبی دائرے میں محصور کر دیتا ہے اور وہ عموماً اُس دائرے کو توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یا اپنی بہترین ادبی کاوشیں اسی معیار کو توڑنے اور رد کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے لئے کوئی ایسا دائرہ نہیں۔ کوئی ایسا دوراہا نہیں کہ جو بقول گوپال متل اُسے تذبذب میں ڈال دے۔ "دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا"۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ "میں اِس سمت جاؤں کہ اُس سمت جاؤں ؟" وہ جمہور سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کی ادبی تخلیق کی سمت متعین ہو چکی ہے۔ اُس کے نفسیاتی شعور نے

اپنے افسانوں میں ایک فکری رہگذار بنا ڈالی ہے۔ جس پر وہ بے کھٹکے، بے دریغ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ دوسرے طبقوں کے ادیبوں کی طرح نہ اُس کے دل میں تذبذب ہے نہ دو مختلف جماعتی مفاد کی پیکار، نہ اُس راستے سے پیچھے مڑ جانے کی تمنا۔ دوسرے طبقوں کے ادیبوں کو اگر وہ حقیقی اور بنیادی طور پر ترقی پسند ادب کی فکری اساس کو قبول کر کے اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُنہیں اپنی جماعت سے اپنے آپ سے نفرت کرنا پڑتی ہے۔ (اور یہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اپنی جماعت اور اپنے آپ سے نفرت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے) لیکن احمد ندیم قاسمی کی زیر نفسی کیفیات اور وارداتِ قلب ان الجھنوں کی حامل نہیں۔ دوسرے طبقوں کے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات اپنے آپ اور اور اپنی جماعت سے نفرت پر شروع ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ کسانوں یا مزدوروں کی محبت پر منتج ہوتی ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کو ترقی پسند ادیب بننے میں ایسے کسی عملِ معکوس (Reverse Process) سے کام نہیں لینا پڑتا۔ وہ فطری طور پر ترقی پسند ادیب ہے۔ وہ اپنی جماعت سے اپنے آپ سے نفرت نہیں کرتا، محبت کرتا ہے۔ قاسمی کے دل میں دوسرے طبقے کے ادیبوں کی طرح کسانوں کے لئے جذبۂ ترحم نہیں ہے۔ یہ تو ایک خالص بورژوائی جذبہ ہے۔ اس کی ذات اور اس کے جماعتی مفاد اُسے خودبخود کسانوں کی ترجمانی کرنا سکھاتے ہیں (اور یہ وہ چیز ہے جو ہمارے ہاں بہت کم ادیبوں کو نصیب ہے) اس زندگی میں کئی صعوبتیں ہیں، کئی مسرتیں ہیں، پٹواری، نمبردار، بنیا، پولیس، یہ سب کسان کی زندگی کا لازمہ ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بار بار آتے ہیں۔ لیکن

ان مختلف اجزائے افسانہ کی ترتیب اور تناسب اِس قدر صحیح ہے کہ یہ افسانے کسانوں کی زندگی کے بہترین عکاس اور اُن کی سماج، معاشرت، رسم ورواج اور گوناگوں جذبات اور ذہنی کیفیات کے جیتے جاگتے مرقعے بن جاتے ہیں۔

"چوپال" کے بعد "بگولے" اُس افسانوی رہگذار پر سنگِ میل ہے جو ہمیں احمد ندیم قاسمی کے ذہنی ارتقار کو ماپنے میں مدد دیتا ہے۔ چوپال میں شیرینی اور رنگینی ہے عشقِ سادہ کی خامکاریاں، دیہقانی زندگی کے خوش آئند لمحے۔ لیکن بگولے میں جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے۔ اِک کربناک فکری تلخی اور صحرائی وحشت پائی جاتی ہے۔ اس کی انتہائی مثال اسی مجموعے کی ایک کہانی "السلام علیکم" میں مل سکتی ہے جب امیر خاں جنگِ عظیم کے بعد اپنے دل میں ارمانوں کی دنیا آباد کئے ہوئے اپنے گاؤں کو واپس آتا ہے اور صبح کاذب کے مٹتے ہوئے اندھیارے میں اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ مصروفِ اختلاط پاتا ہے۔ اور بعد میں اُسی افسانے کے اختتام پر جب وہ اپنی بیوی کی عصمت پر ہات ڈالنے والے کے منہ سے "السلام علیکم" کے مقدس الفاظ سنتا ہے تو پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدس الفاظ اِس سوئے ہوئے گاؤں میں اِک غولِ بیابانی کا نعرہ بن گئے ہیں۔ یہ گاؤں سیدھے سادے دیہاتیوں کا گاؤں نہیں رہا۔ بلکہ جنّات کی بستی، اور بھوتوں پریتوں اور چڑیلوں کا مسکن!

بگولے میں احمد ندیم قاسمی نے کسانوں کی دنیا کا مختلف جہت سے مطالعہ کیا ہے اِن افسانوں میں اُس کا فکری شعور، ذہنی ادراک اور گرد وپیش کا ماحول باہم منطبق نظر آتے ہیں اور یہی چیز فن کار کو افسانوی طور پر کامیاب بناتی ہے۔

چوپال میں محبت کے زیادہ دلکش پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے (وہ محبت جسے پچاس سال سے زیادہ عمر رکھنے والے ادیب "شبابیات" کا نام دے کر ایک خاص قسم کی طنزیہ مسرت محسوس کیا کرتے ہیں، بیچارے!) لیکن "بگولے" میں اکثر افسانے محبت اور سماج، محبت اور روزگار، محبت اور حکومت کی کش مکش کے آئینہ دار ہیں کس طرح سماج اور روزگار اور حکومت، یہ تینوں معاشری ادارے اکثر محبت کا گلا گھونٹ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یا اگر کامیاب نہیں ہوتے تو اسے گزند پہنچا کر اس کی شدت اور اس کے تاثر کے دائرے کو محدود کر دیتے ہیں۔ "میرا انجا" میں امامی کا محبوب امامی سے اس لئے منہ موڑ لیتا ہے کہ خوبصورت امامی اپنے ماں باپ کی جائز اولاد نہیں، اُس پر سماج کے جنسی قوانین کی صالح مہر موجود نہیں۔

"طلائی مہر" میں فیضی اور سونی کی الفت کے درمیان ایک تھانیدار کی نخوت اور حکومت کا استیصال، اور پھر وہ طلائی مہر ہے۔ جسے اپنے خونیں سینے سے چھپائے ہوئے وہ کہانی کے آخر میں اپنی محبوب کے پاس جاتا ہے فیضی نے اپنی تمام مشکلات پر قابو پا لیا لیکن یہاں افسانہ نگار کا حقیقی مقصد اس آدرشی فتح کو دکھانا نہیں بلکہ اُن مشکلات کو بیان کرنا ہے کہ جن سے ایک غریب کسان کی شخصی محبت مجروح کی جاتی ہے۔ "تو بہ میری" میں کریم خاں کی موت اس لئے نہیں ہوتی۔ کہ اس کا کلیجہ بھوت پریتوں نے کھا لیا ہے۔ اُس کا کلیجہ کھا جانے والے وہ لوگ ہیں جو استعداد رکھتے ہوئے بھی اُس کی بیماری کے دنوں میں اُس کی مدد نہیں کرتے۔ سماج کا وہ چکر ہے جو اُسے بیماری کی حالت میں "ملک جی" کے کام کے لئے چھکڑا چلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ راستے میں اُسے سردی لگ جاتی ہے اور وہ اپنے چھکڑے پر بیٹھا بیٹھا

جان بحق ہو جاتا ہے، یہی وہ سماج کا ظالمانہ چکر ہے جس کے بگولے دیہات کے میدانوں میں اڑتے ہیں جنہوں نے کسانوں کے گھروں اور چوپالوں کو کھنڈر بنا دیا ہے اور ان میں انسانوں کے بجائے زندہ بھوت اور غولِ بیابانی آباد کر دیئے ہیں۔ اگر احمد ندیم قاسمی چیخ سکتا تو ہر افسانے کے اختتام پر چلا کر کہتا "بچاؤ، بچاؤ، ہندوستان کے دیہاتوں کو اس خودکشی سے بچاؤ۔" لیکن احمد ندیم قاسمی ایک کسان ہے۔ وہ چیختا نہیں وہ اپنے انتقام کی خاموش آگ اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی اُس کے شعروں میں اس خاموش آگ کے شرارے دہکتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔

جنگ کے دنوں میں جب دیہاتوں میں بھرتی زوروں پر ہوتی ہے اور گاؤں کے گاؤں نوجوانوں سے خالی ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اِن خالی دیہاتوں کی سماجی زندگی کا انتشار اور عجیب بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ دلچسپ اور اکثر حالتوں میں المناک بھی، پچھلی جنگِ عظیم میں جو حالت اکثر فرانسیسی دیہاتوں کی تھی۔ وہی حالت کم و بیش ہندوستان میں اُن دیہاتوں کی بھی تھی۔ جہاں سے سپاہی لوگ بھرتی کیئے گئے تھے مثال کے طور پر ایک ایسے دیہات میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں یا مردوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اِسی تناسب سے اخلاقی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب فوجی محاذ پر لڑ رہے ہوتے ہیں تو اُن کے گاؤں میں تقدیس و وفا کی پتلیاں دن رات ان کے نام کی مالا جپنے میں مصروف ہوتی ہیں احمد ندیم قاسمی نے اِس ضمن میں انہی دو کہانیوں میں جن دلچسپ حقایق کو بیان کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"السلام علیکم" میں جب امیر خاں جنگِ عظیم کے بعد فرانس میں اپنی محبوبہ "لیوسی" کو الوداع کہہ کر ہندوستان میں اپنے گاؤں میں واپس آتا ہے، تو اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کی "لیوسی" بنا ہوا دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے لیکن انسانی فطرت کی فطری کمینگی سے قطعِ نظر اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ قدرت کے قوانین مرد اور عورت دونوں کے لئے مساوی ہیں۔ وہ سماج کے قوانین سے زیادہ کڑے اور مضبوط اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ ہندی عورتوں پر بھی اسی طرح حاوی ہیں۔ جس طرح فرانسیسی عورتوں پر۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے ملک کی عورتوں کو دوسرے ملکوں کی عورتوں سے زیادہ پاکباز، زیادہ باعصمت سمجھتے ہیں (لیکن اس جذبے کی تہ میں خوش فہمی سطحی قومیت اور ایک ذلیل قسم کے احساسِ کمتری کے سوا اور کچھ نہیں)

دوسری کہانی "سُرخ ٹوپی" ہے، یہ بھی پچھلی جنگِ عظیم سے متعلق ہے، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے سپاہی خاوند کو اُس کی نو بیاہتا کس طرح فخر اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتی ہے اور گاؤں کی دوسری عورتیں بھی کس طرح اُس کی حالت پر رشک کرتی ہیں۔ گاؤں والے اپنے سپاہیوں کے متعلق کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ "توپ کا چارہ" یا "پیسے کے ٹٹو" ہیں۔ اس قسم کی سیاسی اصطلاحات کو جو ہندوستان کی شہری زندگی میں رائج ہیں۔ دیہاتوں میں قبولِ عام حاصل نہیں۔ ایک سپاہی اپنے دیہات کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اسی لئے تو جب گاموں کا نام فوج سے کٹ جاتا ہے اور وہ اپنے گھر کے آنگن میں اگر نمبردار کے خلاف زہر اُگلتا ہے۔ جس نے اُس کے خلاف رپورٹ کر کے اُس کی نوکری چھڑوا دی تو اُسکی نو بیاہتا مغموم اور شرمندہ سی ہو جاتی ہے اور نمبردار نے گاموں کے خلاف کیوں

رپورٹ کی ؟ اس لئے کہ گاموں شہری مسلمانوں کی تقلید میں سُرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ شہری مسلمان اِس بات پر ہنسیں گے لیکن بعض اوقات حقیقت سُرخ رنگ کی ترکی ٹوپی سے زیادہ سُرخ اور خونیں ہوتی ہے اور معصوم گاموں اور اس کے خلاف رپورٹ کرنے والے ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں پلئے جاتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا اندازِ بیان بے حد نرم و نازک اور شیریں ہے۔ اُس کے فسانے "سوفی" کی طرح خوبصورت ہیں۔ وہ سوفی جس کے متعلق اُس نے "طلائی مہر" میں یوں لکھا ہے:۔

"سوفی . . . . بہت شرمیلی اور سمٹی سمٹی جیسے گلاب کی کلی جو سُورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجائے اور پتوں میں چھپ چھپ جائے . . . . .
گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا، پیلی چھینٹ کا لہنگا، جاپانی اودے ریشم کی قمیص۔ سر پر تاروں بھری اوڑھنی، ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل، کانوں میں جھم جھم کرتے بُندے جن کے نیچے جیسے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے گلے میں ہنسلی جس سے چاندی کے گھنگھرو لٹکتے رہتے . . . . .
ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجنیں، جو ہر قدم پر ایسا چھنا کا پیدا کرتی تھیں جیسے بیشمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رُک رُک کر کو کو پکار رہی ہوں"

(طلائی مہر)

لیکن یہ دلآویز خوبصورت افسانے جن میں کسی کوہستانی دوشیزہ کی سی رعنائی اور دلکشی ہے، اپنے نازک سینوں کے زیر و بم میں ایک احتجاج بہیم کا طوفانِ عظیم چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ان کی گونج سُن سکیں۔ اگر آپ اس خاموش احتجاج سے متاثر ہو کر کسانوں کے لئے اپنے دل میں محبت اور رفاقت کے پاکیزہ جذبات کی تخلیق کر سکیں۔

تو احمد ندیم قاسمی اور اُس کے رفقا۔ کی محنت اکارت نہ جائے گی۔ احمد ندیم قاسمی کسانوں کی زخمی زندگی کا عکاس ہے۔ اُن کی مجروح محبت کا نمائندہ ہے' وہ خود زمین اور انسان سے محبت کرتا ہے اور آپ سے بھی اسی محبت کا طالب ہے۔ آپ کی محبت کے بھروسے پر کسان بہت کچھ کرسکتا ہے۔ وہ اُس "طلائی دیوار" کو جو زندگی اور اُس کی خوشیوں کے درمیان کھنچی ہوئی ہے۔ اپنے زخمی سینے کی اُبلتی ہوئی طاقت سے شکستہ اور چکنا چور کر سکتا ہے اور فیض اور سوفی کی اُلفت کی طرح پھر زمین اور انسان کا اتصال کرا سکتا ہے۔ وہ اتصال جس کے بغیر انسانی مسرت ممکن نہیں۔

"اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں ہر قدم پر ایک دلآویز چھنا کا پیدا کرتی ہیں اور جس کی ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل ہے۔ اپنی پیلی چھینٹ کے لنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے۔ اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں میں تھما دی' تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے' ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اُٹھے اور ملائم' دہکے ہوئے' بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے۔"

(طلائی مہر)

دہلی

یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

کرشن چندر

میرے افسانے

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے فردوس میں اجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

جن کو تو رستم و سہراب کہا کرتا ہے
وہ جواں میں نے یہاں خاک بسر دیکھے ہیں

تیرے ماحول میں ہے جن کی پرستش بھی روا
میں نے اس حسن کے پُرہول کھنڈر دیکھے ہیں

میں نے گھوروں پہ پڑے دیکھے ہیں رخشندہ نجوم
میں نے لپٹے ہوئے کیچڑ میں قمر دیکھے ہیں

میں نے پھولوں کو عفونت میں پھنسے دیکھا ہے
میں نے ملتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھے ہیں

میں نے ان آنکھوں سے بکتا ہوا دیکھا ہے شباب
زر کی تلوار سے کٹتے ہوئے سر دیکھے ہیں

میں نے دیکھے ہیں رئیسوں کے لتاڑے ہوئے دل
میں نے جھلسے ہوئے آہوں سے جگر دیکھے ہیں

میں نے گلیوں میں تو دیکھے ہیں گلابی چہرے
اور طاعون پسِ پردۂ در دیکھے ہیں

میں سمجھتا ہوں مہاجن کی تجوری کے راز
میں نے دہقان کی محنت کے ثمر دیکھے ہیں

سبز کھیتوں میں مجھے زہر نظر آیا ہے
زرد خوشوں کی رداؤں میں شرر دیکھے ہیں

میں نے جو دیکھا ہے، اے کاش! وہ تو بھی دیکھے
دل کی دھڑکن بھی سنے، دل کا لہو بھی دیکھے

ندیم

طلائی مہر

ہڈیاں چٹخیں، پسلیاں چرچرائیں اور سوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

اور اب پٹواریوں، جاگیرداروں اور نمبرداروں کے ہجوم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کا زاویہ بدلتے ہوئے نکلا اور کڑکا۔ "ایسا ضرور ہو گا! یہ میرا حکم ہے اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔ ہمیشہ بھر تم اپنی زمینوں میں ہل نہیں چلا سکتے۔ نہ تم کھیتوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔ نہ گوبھی کی کیاریوں کو پانی دے سکتے ہو۔ تم نے ڈاکوؤں کو پناہ دے رکھی ہے اور جب تک تم اپنے کئے کی سزا نہ بھگتو گے۔ تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئینگے تم لاتوں کے بھوت ہو!"

ایک پھٹے ہوئے چوغے والا نوجوان مجمع چیر کر آگے بڑھا۔ اُس کے گلے کی رگیں

پھول رہی تھیں۔ بازوؤں کے پٹھے تن گئے تھے۔ اور رنگ چقندر کی طرح لال تھا۔ وہ تھانیدار کے مقابل جا کر پکارا۔ "لیکن ہم تباہ ہو جائینگے حضور۔ ہم مر جائیں گے۔ ہم غریب آدمی ہیں!"

اور مجمع سے دبی دبی آوازیں آئیں "اے فیض، فیض! کیا کرتا ہے! پیچھے ہٹ آ"

سامنے سے تھانیدار نہایت تند لہجے میں اس کی ماں اور بہن کی آبروریزی کرتا ہوا دھاڑا۔" یہ منہ پھٹ چھوکرا کون ہے؟ بدزبان، بے حیا، ارے تم غریب ہو تو یہ تمہارے اپنے ماتھے کا لکھا ہے۔ تمہاری غریبی میرے حکم کی راہ میں روڑا بن کر کیوں اٹکے کل شام تک تم سب اپنے جھونپڑے چھپڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک مہینے تک نہ ہل چلاؤ۔ نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرو۔ نہ گوبھی کو پانی دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میرے ڈنڈوں کی ضرب اس قدر سخت ہے کہ کئی بدمعاش آج تک ماتھے پر پٹیاں باندھے میرے سائے سے چھپتے پھرتے ہیں۔"

ایک بوڑھا کھوسٹ پرلی طرف سے ایک بیری کے تنے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم پر رحم کیجئے مالک!" اور تھانیدار پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ "میں کیا جانوں رحم کون بلا ہے میں رحم کرنا نہیں جانتا۔ میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے!"

اور دور سفید بادل کے سائے میں ایک باز ایک تھکے ہوئے نیلے کبوتر پر جھپٹا اور اسے پنجوں میں دبوچ کر نچے کھچے پر فضا میں بکھیرتا، تھانے کی کالی عمارت کی طرف اُڑ گیا!

ان دنوں علاقے میں دو ڈاکو پھر رہے تھے۔ جنہوں نے قرضے کے بوجھ سے تنگ آ کر گاؤں کے ایک سیٹھ کا پیٹ چاک کر دیا اور لمبی لال پوتھیاں جلادیں کئی بار ایسا ہوا کہ ڈاکو پولیس کی زد میں آ گئے۔ مگر پولیس والوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے پاس

سرحد پار کی بندوقیں ہیں اور اُن کی بے پناہ نشانہ بازی کے چرچے تو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے! وہ ڈاکوؤں کی آمد کی خبر پاتے ہی وردیاں پہننے اور پٹیاں کسنے لگتے اور ڈاکو اندھیری گھاٹیوں کے گہرے غاروں میں دبک جاتے ——— اور پھر اوپر رپورٹ بھیجدی جاتی کہ گاؤں والے ڈاکوؤں کو چھپائے رکھنے پر متفق ہوگئے ہیں لیکن ان پر مناسب دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ عنقریب اُنہیں زبردست زک پہنچے گی۔ اور وہ سب راز اگلنے پر مجبور ہو جائیں گے ——— گاؤں پر پچھلے دو مہینوں سے تعزیری چوکی کا دیو بھی مسلط کر دیا گیا تھا۔ اور وہ لوگ جو صبح جَو کی روٹی کھو لتے پانی کے ساتھ نگل کر شام کے کھانے کی فکر میں غرق ہو جاتے تھے۔ ہر مہینے کچھ رقم مہیا کرنے پر مجبور کر دیئے گئے! اس سلسلے میں اتنا سننے میں آیا کہ ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اس لئے برداشت کر لیتا ہے کہ صبح سویرے اسکی ڈبڈبائی آنکھوں والی لڑکی اس کی ہتھیلی پر چونّی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے اور ایک بڑھیا جس کا خاوند مرگیا تھا اور بیٹا شبے کی بنا پر پھانسی پا چکا تھا۔ کھلتے پیتے لوگوں کا غلہ پیستی پیستی چکّی کے پاٹوں پر سر رکھ کر ٹھنڈی ہو گئی! ——— اور جب اس قدر سختی کے باوجود ڈاکوؤں نے خود بخود تھانے آکر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہ کیا تو اوپر سے حکم لیا گیا کہ گاؤں سے باہر جو لوگ کھیتوں کی حفاظت کے لئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ ڈاکوؤں کو پناہ دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہل چلانے، کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے، اور گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا جائے۔ تاکہ وہ اس دباؤ سے تنگ آکر سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔

زمینیں ٹھنڈ سے اکڑ گئیں! کھیت مرجھا گئے! گوبھی کے پھولوں پر گرد جم گئی لیکن

حکم حاکم مرگِ مفاجات چُپ سادھے بیٹھے رہے کبھی کبھی دبے پاؤں اپنے کھیت دیکھنے چلے جاتے بیلنڈھوں کی خشک گھاس پر جمی ہوئی یخ چادر، اُن کے پاؤں کے نیچے چُٹخنی تو اُن کے کلیجے کٹ جاتے ! اور جب گوبھی کے چوڑے چوڑے پتوں پر زردی بکھری ہوئی دیکھتے تو اُن کے روئیں روئیں سے چنگاریاں سی جھڑنے لگتیں۔

لیکن اس قدر تباہی کے باوجود فیض کی کیاریاں اسی آن بان سے لہلہاتی رہیں۔ اور جب شام کو تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سائے جم کر رہ جاتے اور جب جھیل کے اس طرف کوئی بھٹکی ہوئی مرغابی کنارے کی کائی میں گھس کر پھڑپھڑاتی تو فیض گھر سے باہر نکلتا۔ اور دیواروں سے لگ کر چلتا جھاڑیوں کے پیچھے دبکتا۔ آباد راہوں سے کتراتا اپنے کنوئیں پر چلا جاتا۔ ٹین کی ڈول سے پانی نکالتا۔ گوبھی کی کیاریوں کو لبریز کر کے موٹے موٹے پورے چاند ایسے پھول اکھیڑ کر ایک ٹوکرا بھرتا اور قصبے کے بوڑھے کنجڑے کے ہاں پہنچا کر گاؤں لوٹ آتا اور جب جھٹپٹے کے وقت لوگ مسجدوں کی طرف جاتے تو فیض کو اپنی جھکی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر بھوبی گاتے کے اس طرف ایک موٹا کمبل اوڑھے خراٹے بھرتا پاتے۔

فیض گاؤں بھر میں ایک ہی شرمیلا اور کم ہمت نوجوان سمجھا جاتا تھا لیکن اپنے دوست فتح دین کے بیاہ میں شریک ہوتے کے بعد اچانک اُس کے دل نے ایک پھریری لی اور دوسرے روز اپنے ایک دشمن پر بیدھڑک آوازے کس دیئے ! اس کے ہم عمر دوست بہت ٹھٹکے اور فیض کی فطرت کے اتنے زبردست پلٹے پر قسم قسم کی خیال آرائیاں کیں —— "کہیں سے پستول ہاتھ لگ گیا ہوگا" —— "اب کے اس کی گوبھی کی کیاریاں آباد ہیں نا" —— اور اس قسم کی دیگر باتیں

لیکن اصل بات کسی کو نہ سوجھی - اور وہ بات بہت چھپی چھپی تھی۔ کیونکہ اس بات کو صرف فیض اور سونی ہی جانتے تھے۔!

سونی گاؤں کے بوڑھے چوکیدار کی لڑکی تھی۔ بہت شرمیلی اور سمٹی سمٹی، جیسے گلاب کی کلی جو سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجائے اور پتوں میں چھپ چھپ جائے! باپ کی اکلوتی بیٹی تھی - اِس لئے اپنی مرضی کے خلاف بنی ٹھنی رہتی تھی۔ گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا۔ پیلی چھینٹ کا لہنگا۔ جاپانی اودے ریشم کی قمیص سر پر تاروں بھری اوڑھنی - ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل۔ کانوں میں جھمبر جھمبر کرتے بندے جن کے نیچے جیسے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے! گلے میں ہنسلی جس سے چاندی کے گھنگھرو ٹنکے رہتے۔ گوری باہوں میں دھانی چوڑیاں اور پھر پاؤں میں سبز جوتوں کے اوپر ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجنیں جو ہر قدم پر ایسا دلآویز چھنا کا پیدا کرتی تھیں۔ جیسے بے شمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رُک رُک کر کو کو پکار رہی ہوں۔!

فیض، فتح دین کی شادی پر اپنا بہترین لباس زیب تن کئے اپنے دوستوں کے ہمراہ چھت پر بیٹھا کنواریوں کے گیت سُن رہا تھا۔ آٹھ دس لڑکیاں مل کر گا رہی تھیں۔ جوان میراثن سینہ تانے ڈھولک بجاتی۔ دانت نکالتی اور جھومتی اور جب گیت کا آخری سُر نازک گلوں میں مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا تو ڈھولک کی دھما دھم دھپ کے ساتھ نئے گیت کی ابتدا ہو جاتی۔ کوٹھوں پر گاؤں والے دبکے بیٹھے تھے۔ ٹنڈ منڈ نیموں اور بیریوں میں شریر بچے چھپے گیت سُن رہے تھے اور نیچے صحن میں لال اودے پیلی اوڑھنیاں اور اودے اور گلابی لہنگے۔ لالٹینوں کی پیلی روشنیوں میں ٹپتی ہوئی

قوس قزح کی طرح جھلک رہے تھے۔ ایک نیا گیت شروع ہوا۔ میراثن کی انگلیاں ڈھولک پر والہانہ رقص کرنے لگیں اور لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازیں بلند ہوئیں۔ جیسے کوئی سازندہ۔ آٹھ دس سارنگیوں کے تاروں کو جھنجھنا رہا ہو کہ اچانک سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں اور سارے مٹیالے منظر کو ایک تنہا آواز کا تیز نشتر چیرتا ہوا افق کی طرف اڑ گیا! الفاظ فضا میں کروٹیں لینے لگے۔

ترس ترس کر جی اور ہنس ہنس کر مر۔ کہ ترستی

زندگی اور ہنستی موت ——————!

اور اچانک آواز رک گئی۔ اور گانے والی کو احساس ہوا کہ شریر لڑکیاں اِس کی آواز سننے کے لئے چپ ہو گئی ہیں۔ وہ اِس سازش پر غصے اور شرم کے مارے میراثن کی ڈھولک کے قریب فرش پر سر رکھ کر سہمی سہمی گنگنانے لگی اور لڑکیاں جھک جھک کر اور لیٹ لیٹ کر یوں ہنسیں۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اچانک ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں!

چھت پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ایک بولا "آواز تھی یا سونے کا ایک تیر تھا جو دلوں کو چیرتا ہوا پار کر گیا۔

دوسرے نے کہا "آواز تھی یا اُس کبوتر کی اڑان تھی جس کے پنجوں سے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں۔" اور ایک طرف سے فیض دبی دبی آواز میں بولا "آواز تھی یا شفاف تالاب کی تہ میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں" نوجوان رک رک کر ہنستے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ گئے۔ اور فیض کو ٹھوکے دیتے ہوئے بولے۔

"کچھوا اور ناچے!"

"مینڈک اور ملہار گائیے!"

"چھچھوندر اور سر میں چنبیلی کا تیل ڈالے!"

اور فیض اپنی ذرا ذرا سی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "بھئی ہمارے بھی دل ہے!"

سب نوجوان چپ ہو گئے۔ جیسے انہیں فیض کی یہ دلیل پسند آگئی ہو! اتنے میں منڈیر کے قریب ایک نوجوان سر اٹھا کر بولا "لیکن یہ تھی کون؟"

"سونی!"

سونی؟

"ہاں چوکیدار کی لڑکی، وہ بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہے اور لجائی رہتی ہے۔"

"ہاں ہاں وہ بجلی!"

"اچھا وہ جادوگرنی!"

اور جب آدھی رات کو لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ چند لڑکیاں لمحہ بھر کے آرام کے لئے صحن میں سو گئیں۔ اور کچھ اپنے گھروں کو چل دیں۔ تو فیض ایک اندھیری تنگ گلی میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ بعض لوگوں کی آواز میں کتنی لذت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے کانوں کے راستے کوئی شہد کے گھونٹ پلا رہا ہے! اور اس کا جسم تپ گیا اور دل ناچنے لگا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا یوں نکو بن کر بیٹھے رہنا اس کی جوانی کے ماتھے پر کالا بدنما داغ ہے اور سونی یا کسی اور الھڑ لڑکی کو باہوں پر ڈال کر اندھیری گھاٹیوں میں دھیرے دھیرے ترستی زندگی اور ہنستی موت کے گیت گانے میں جو کیفیت ہے وہ آرام سے ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں لمبی

تان کر سونے میں بھی نہیں!

چونکہ اس کا گھر گاؤں کے پرلے سرے پر تھا۔ اس لئے اُسے یہ انوکھی باتیں سوچنے کے لئے بہت وقت مل گیا اور جب وہ پُرانے قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب سے گذر رہا تھا تو چہ چہ کرتے جھینگر اچانک چپ ہو گئے اور ٹڈیاں اپنی طویل اور باریک "ہیں ہیں" کو روک کر دم بخود رہ گئیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی کہ اچانک فیض ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے کانچ کی چوڑیوں کی آواز سنائی دی —— اور اُسے احساس ہُوا کہ کوئی لڑکی اس سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہے۔ یہ کھنکھناہٹ فیض کو فتح دین کے صحن میں لے آئی اور پھر وہ گرجتی ہوئی ڈھولک اور جھومتی ہوئی میراثن، وہ زنگار رنگ لباس اور وہ چوڑیاں —— اور پھر سونی کی آواز جو اندھیرے منظر کو چکا چوند کرتی افق کی گود میں سو گئی —— اور اسے ترستی زندگی اور ہنستی موت کا خیال آیا —— موت اور ٹوٹی ہوئی قبروں والا قبرستان! —— سوکھے ہوئے ڈھنچر اور خوفناک ڈائنیں، جو راتوں کو چوڑیاں بجاتی ہیں۔ اور شکستہ دیواروں کے سوراخوں میں راہ چلتوں کو دبوچنے کی تاک میں چھپی رہتی ہیں! لمحہ بھر کے لئے اس کے دل پر جیسے برف کے گالے پڑ گئے لیکن اچانک ایک اضطراری حالت میں وہ گرج کر پکارا "کون ہے تو؟"

"سونی"۔ آواز آئی اور فیض کو محسوس ہُوا کہ واقعی قبرستان کے ایک کونے پر چھوٹے سے گڑھے میں جو پانی جمع ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے کسی سوئی ہوئی جل پری نے جس کی کلائیوں پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں سج رہی ہیں۔ کروٹ بدلی ہے۔ جسم کے ہر مسام سے پھوٹتا ہُوا پسینہ اور پسینے کے ہر قطرے میں جھلملاتی چنگاریاں اور دہکتا

اور دھنکتا ہوا بدن اور رقص کرتی ہوئی رُوح! ـــــ فیض کے اوسان لڑکھڑائے اور اس اندھیرے منظر کی خنک تنہائی میں اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ سونی کے ہمراہ کسی دور دراز ملک کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ سونی کا سر اس کے کاندھے پر ہے اور اس کی زلفیں فضا میں مسحور ناگنوں کی طرح لہرا رہی ہیں اور اس کے ٹخنوں کی چھاجھنوں کے چھناکے سے فضا۔ ۔ ۔ گنگنا رہی ہے۔

اچانک جھینگروں اور ٹڈیوں کی مسلسل تانیں خاموش نظاروں پر نشتر زنی کرنے لگیں اور فیض اس قبرستانوں اور تاریکیوں کی دنیا میں لوٹ آیا بولا" یہاں کیا کر رہی ہو سونی ؟"

اور سونی بھرائی ہوئی آواز میں بولی" یہاں میری سونے کی مہر گر پڑی ہے۔ میں نے یہ مہر جاگیر دار کی بیٹی سے آج رات کے لئے لی تھی اور میں اب فتح دین کے گھر سے اُٹھ کر آ رہی تھی کہ یہاں مجھے چند ایک سہیلیوں نے چھیڑا اور ٹھٹھے مخول میں مجھے مہر کا خیال نہ رہا اور جب میں گھر پہنچی تو ماتھے کو خالی پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ واپس آ کر یہاں اندھیرے میں خاک پر ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں۔ مہر لڑھک کر ادھر دھنسی ہوئی قبروں میں گر گئی تو کب ملے گی اور مجھے باپ بہت خفا ہو گا۔ کہ میں نے دم بھر کی رونق کے لئے ایسا غضب ڈھایا۔"

فیض کا جی بھر آیا۔ جیب سے ڈبیا نکالی اور ایک دیا سلائی روشن کی۔ پہلی نظر سونی کے ماتھے پر پڑی۔ جس کے عین وسط سے سیدھی مانگ اوپر لپک کر اوڑھنی میں چھپ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پتلے پتلے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کی مکھن ایسی کلائیوں پر کانچ کی بے شمار چوڑیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اسکے

ہاتھ خاک آلود تھے۔

"فیض" وہ تعجب سے پکاری! اور فیض خوشی سے ہانپنے لگا کہ سونی اسکا نام جانتی تھی اور کسی دوشیزہ کو ایک نوجوان کا نام یاد رہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس نوجوان میں کوئی خصوصیت موجود ہے۔

پھر رچھر روپا سلائیاں جلنے لگیں اور آخر کار فیض ایک قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑ میں سے مہر اٹھا لایا۔ اسے چولے سے پونچھا اور سونی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "لو سونی، شکر ہے مل گئی۔" اور جب اس کی خاک آلود انگلیاں سونی کی خاک آلود انگلیوں سے مس ہوئیں تو اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ ٹڈیاں چیخ اٹھیں جھینگر چلّانے لگے اور دونوں نے محسوس کیا کہ ان کے جسم کپکپا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں۔ ان کی انگلیاں پسیج رہی ہیں۔

کانپتی ہوئی آواز میں سونی بولی "تم نے بہت تکلیف کی۔ قبرستان کے کنارے قبروں کے درمیان ہاتھ پھیرتے پھرنا بہت حوصلے کا کام ہے۔"

اور فیض بولا "اور یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات قبرستان کے کنارے اور قبروں کے درمیان ہوتی! ——— اور سونی یہ اندھیرا کتنا گہرا اور گاؤں کتنا خاموش ہے ——— اور سونی تم نے وہ ترستی زندگی اور ہنستی موت کا گیت کتنا اچھا گایا تھا ——— لیکن سونی تم شرما کیوں گئی تھیں ——— تم اب کس رستے گھر جاؤ گی۔ کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا آؤں ——— اور سونی ——— سونی تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

اور سونی اندھیرے میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "میں تو تمہارا

نام مدت سے جانتی ہوں۔ کیونکہ تم میری پھوپھی کے پڑوس میں رہتے ہو۔"
اور فیض یہ بھولا بھالا جواب سن کر جھینپ سا گیا اور بولا۔ "اکیلی جاؤ گی؟"
"ہاں کیا ہرج ہے۔ ادھر جاگیردار کا کتا کبھی کبھی جھپٹ پڑتا ہے۔ ورنہ کیا ہرج ہے۔"
اور پھر جب فیض اسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچا کر لوٹنے لگا تو سونی بولی "تم نے بہت تکلیف کی!"
بہت پرے ایک گلی کی نکڑ پر بیٹھا ہوا چوکیدار چلایا۔ "خبردار" —— اور فیض نے آہستہ سے کہا۔ "تمہارا باپ جاگ رہا ہے۔ ہولے ہولے چلو۔ تمہاری جھانجھنوں کا چھناکا نہ سُن لے!" —— اور فیض نے محسوس کیا کہ سونی اندھیرے میں مسکرا رہی ہے!
وہ رات کی وجہ سے سونی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے دل و دماغ پر ایک خاص پیکر کا نقش جم گیا جس کی مانگ ستاروں کو گھول کر بنائی گئی تھی! اور جس کی خوبصورت چھاتیاں اور ابھرے ہوئے کولھے اور سفید ٹخنوں پر گنگناتی جھانجھنیں اور گرد آلود اور نلپتی ہوئی انگلیاں اور —— اور وہ بہت سی باتیں تھیں۔ جن کا اُسے پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن جواب اُس کی نس نس میں نشے بن کر گردش کر رہی تھیں۔
اور یونہی زندگی کے اڑتے ہوئے لمحوں میں فیض اور سونی نے چند ایسی گھڑیاں چُن لیں۔ جن میں ان کے دھڑکتے دِل رک جاتے اور جھپکتی آنکھیں ایک دوسرے کو گھورتی رہ جاتیں اور سونی سینہ تانے، بازو لہراتی، آنچل پھڑپھڑاتی، کوندے

کی طرح لپکتی ہوئی ہرتی پھرتی گلیوں میں غائب ہو جاتی اور فیض ننھی ننھی مونچھوں کو بل دیکر ہتھیلیوں پر ایسے ایسے پتھر اٹھاتا کہ کسی بیل کی پیٹھ پر رکھ دیئے جاتے تو وہ پچک کر زمین سے لگ جاتا۔

اب سونی کی ایک سہیلی کا بیاہ نزدیک تھا اور جاڑوں کی ایک سرد رات کو جب سارے گاؤں پر کہرا سا پھیلا ہوا تھا اور بکھرے ہوئے کھیتوں کے کنارے ٹڈے چرچرا رہے تھے۔ ایک کھنڈر کے پاس فیض نے سونی کے صاف چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤں گا تمہارے لئے سونے کی مہر۔ میں اب کے گوبھی کی رقم اکٹھی کرتا رہوں گا اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہلے کورے سونے کی ایک چمکتی دمکتی مہر تمہارے اس چاند سے ماتھے پر جھم جھم کرتی نظر آئے گی اور سونی شاید تم نہیں جانتی کہ میں اس قسم کی کتنی مہریں تمہارے قدموں پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ اور سونی —— سونی تم کتنی اچھی ہو"!

اور سونی نے فیض کے بالوں میں پھنسی ہوئی ہاتھی دانت کی ننھی سی کنگھی کو اپنی انگلیوں میں گھما کر کہا "تمہیں تکلیف ہوگی فیض —— سونے کی مہر میں جاگیردار کی بیٹی سے مانگ لوں گی"! اور پھر اچانک انہیں پہلی رات یاد آگئی۔ جب جاگیردار کی بیٹی کی مہر ایک دھنسی ہوئی قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑوں میں پڑی ملی تھی۔ اور پھر وہ انگلیوں کا آتشیں مس اور اس کے بعد وہ خاموش راتوں کی پُرشور گھڑیاں —— دونوں ایک دوسرے کی ڈبڈبائی ہوئی پتلیوں میں ماضی کا ناٹک دیکھنے لگے اور تب تک دیکھتے رہے۔ جب ایک مرغ نے دور ایک کی ٹہنی پر اس

زور سے بانگ دی سونی کا جسم کانپ گیا اور فیض کی آنکھیں جھپک گئیں

اور اب تھانیدار کے حکم سے لوگوں کو گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا گیا۔ لیکن راتوں کو فیض کے کنوئیں سے بے شمار ڈولیں چھلکتی ہوئی نکلتیں۔ اور گوبھی کی کیاریوں میں سرنگوں ہو جاتیں۔ لوگ فیض سے شکایت کرتے کہ تم چمگادڑ کی طرح دن کو کیوں سوتے ہو؟ اور فیض جواب دیتا کہ جب انسان بیکار ہو تو رونے یا سونے کے سوا وقت کیسے کٹے!

اور بیس دن بعد جب فیض کے پاس چودہ روپے جمع ہو گئے۔ تو وہ قصبے کے سنار سے ایک بہر بنوا لایا جس کے پیچھے گولا کھ چمٹی ہوئی تھی۔ لیکن جس کے سامنے سونے کا ایک پتلا پترا جگمگ کر رہا تھا اور جس کے ساتھ ننھی سیپیوں ایسے پترے اور شفاف شبنم ایسے موتی یوں لٹک رہے تھے۔ جیسے چاند کے کنارے پر کسی نے تاروں کی جھالر ٹانک دی ہو!

اندھیری شام کو وہ گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پہ پہنچا ہی تھا کہ راستے کے کنارے گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ میں سے چار سائے لپکے اور اُسے دبوچ لیا۔ وہ بہت چیخا چلایا۔ وجہ پوچھی لیکن اسے گھسیٹ کر چوپال پر لایا گیا۔ یہاں تھانیدار گیس کی روشنی میں اپنے لمبے طرّے سمیت بیٹھا سامنے ٹک ٹک گھور رہا تھا۔ فیض کو دیکھتے ہی اس کے نتھنے پھول گئے اور بہترا اوپر فضا میں اٹھ گیا اور پھر تڑاپ تڑاپ کا شور اور الو کے پٹھے! کمینے! حرامزادے! بدمعاش! اور جانے کیا کیا —— اور پھر ادھ موئے فیض کے گٹھڑی بنے ہوئے جسم کو بوڑھے چوکیدار نے گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا اور تھانیدار پکارا۔ "راتوں کو چھپ چھپ کر اس نے کیاریوں کو پانی دیا ہے

اور گومتی کے پھول بیچے ہیں۔ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر پھر کوئی اس قسم کا بدمعاش میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا! میں تمہاری ماؤں اور بہنوں ——" اور پھر دہقانوں سے پٹی ہوئی گلیاں اچانک سنسان ہو گئیں تھانیدار پیچوان کے کش لگاتا اندر گدگدے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اور بوڑھا چوکیدار اس کے پاؤں دابنے لگا فیض چوپال کی سیڑھیوں پر سے کھسک کر اترا اور کراہوں کو روکتا گلی کے اندھیرے میں چھپتا قبرستان کی شکستہ دیوار کے پاس بیٹھ کر سستانے لگا اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جسکے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجنیں ہر قدم پر ایک دلآویز چھنا کا پیدا کرتی ہیں، اور جسکی ناک میں چاندی کی موتی الیسی کیل ہے۔ اپنے پیلے چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں پر تھما دی تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے! اور ملائم دہکتے ہوئے بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے! ٭

توبہ میری

"کھنوں کھنوں —— اے کھنوں ۔ توبہ میری! کھنوں، ذری باہر آنا بڑھیا —— ب —— بڑھیا! وہ لٹیا ادھر سرکا دے ری ۔ توبہ میری! کھنوں کھنوں ۔ کریم تو اب اچھا ہے، تو کدھر جا کر مر گئی؟ توبہ میری!"

چُونے کی سی سفید ڈاڑھی، گنجا سر، لٹکی ہوئی ناک، اندر گھسے ہوئے ہونٹ، ہلوٹیں پڑا چہرہ! جیسے کوئی لاش بیٹھی کھانس رہی ہے! دہلیز کے باہر ایک کھٹولے پر بیٹھا پھیپھڑوں کے سمٹنے پھیلنے کے جھٹکوں سے گھٹنوں میں سر دیئے جھک جھک جاتا تھا۔ ساتھ کی دیوار بلغم سے پٹی پڑی تھی۔ دُور دو بیل کھڑے خشک تنکوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس پار پنہاریاں پانی بھری گاگروں سے لدی سینہ تانے ایک گلی میں گھسی جا رہی تھیں۔

کبڑی بڑھیا اندر سے ہانپتی ہوئی نکلی: "ارے کیا شور مچا رکھا ہے تو نے؟ گھڑی بھر

کیلئے اندر جاتی ہوں کہ تیرے گولی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر لُٹیا کھسکا لی ہوتی۔"

بوڑھا کھانستے ہوئے بولا "اے اتنا غصہ نہ دکھا۔ گھونٹ بھر پانی پلا دے میرا حلق جل رہا ہے۔"

"تجھے کیا معلوم اندر تیرے لال پر کیا بیت رہی ہے۔ سانس لینا بھی دوبھر ہے آگے سے اب پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا ہے، ہاتھ پیر جھٹکاتا ہے اور بے مطلب باتیں کرتا ہے۔ ایک بار تو پتھرا گئی تھیں اُس کی آنکھیں۔"

بوڑھے نے لٹیا لے کر وہیں دھر دی اور کھٹولے پر سے اپنی سوکھی لکڑی ایسی ٹانگیں لٹکا کر بولا "اے ذری مجھے تھام کے لے چل۔ میں سمجھا ہو گی تاپ ہے اُتر جائیگا۔ تُو نے تو بڑی بھکی بات کر دی۔ کلیجہ دہلا دیا میرا۔ لے ذری تھام میرا ہاتھ، کھینچ مجھے توبہ میری۔"

کھسکتے ہوئے دونوں اندر گئے۔ پھٹے پُرانے بستر پر ایک نوجوان پڑا کراہ رہا تھا گردن کو اس بےقراری سے جنبش دیتا تھا۔ جیسے اُس کے منہ میں شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ پاؤں یُوں جھٹکتا تھا۔ جیسے تپتے لوہے پر چل رہا ہے، ہونٹ اوپر چڑھ گئے تھے بتیس کے بتیس خوبصورت زرد دانت مسوڑوں سمیت نظر آ رہے تھے!

بوڑھا اس کی کھاٹ کے قریب جا کر گر سا پڑا "اے کریم خاں، اے کریم بیٹا، بیٹا کریم، اے کریمو، اے بات سُن میری۔ سن رہا ہے کیا؟ کھؤں ـــ کھؤں کھؤں ـــ کھؤں ـــ اے ـــ اے سنتا ہے کچھ؟ تیرا بوڑھا باپ تیرے سامنے بیٹھا ہے۔ کیا کھائیگا؟ پانی پئے گا؟ پیاس ہے؟ نہیں ہے؟ ـــ ارے دیکھ سر ہلا رہا ہے تیرا لال ـــ پیاس نہیں ہے اسے۔ کیا کھائیگا؟ صبح والی کھچڑی گرم

کرلا ——— اسے سنتی ہے؟ ——— کریم بیٹا تم بولتے کیوں نہیں؟"
بے قرار سُرخ آنکھیں بوڑھے کے زرد چہرے پر جم گئیں۔ اور پپڑیاں جمے ہونٹوں میں ناتواں سی جنبش ہوئی "میرے دل پر بہت بوجھ ہے ابا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"یہ بخار کمبخت اسی طرح شدت سے چڑھتا ہے۔ اور اُترتا بھی پل میں ہے بس چٹکی بجاتے میں۔" بوڑھے نے اپنی بوڑھی بے رونق انگلیوں سے چٹکی بجانا چاہی مگر ناکام رہا!
نوجوان پھر اسی دھیمی دردناک آواز میں بولا "کل مولبی جی کہہ رہے تھے ہیں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا۔ اس لئے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے" ——— اُس نے چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔
بوڑھا بھی ڈر گیا مگر تسلی دیتے ہوئے بولا "آج اسی لئے تو بہت سی گھنگنیاں بانٹی تھیں تمہاری ماں نے مٹھی مٹھی بھر معصوم بچوں کو دیتی گئی۔ اور وہ تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگتے رہے شکر ملا کر مولبی جی کے ہاں بھی بھجوا دی تھی۔ کورے برتن میں ڈال کر بڑھیا نیم تلے بھی بکھیر آئی تھی۔ اب تو اچھا ہو جائیگا۔ لے آئی کھچڑی؟" بوڑھے نے ہاتھ ٹیک کر پلٹتے ہوئے کہا "رکھدے ادھر۔ اٹھا اپنے لال کو۔ کھالے میرے بچے دو چار دانے نگل لے۔ طاقت آجائے گی۔ پریشانی دُور ہو جائے گی۔ نہیں کھائیگا۔ تو وہیں ہنڈیا میں ڈال آری۔ باہر رہنے سے بُو پڑ جائے گی اس میں۔ شام کو کام آئے گی۔ بچے کچھ سونے کی کوشش . . . کھوں ——— کھوں کھوں ——— کھوں ——— اغ ——— اغاہ ——— بھوہ" بوڑھا زمین پر جھک گیا اور پھر دونوں

آنکھیں کپڑے سے رگڑتے ہوئے بولا: "توبہ میری!"

کبڑی بڑھیا ہانپتی ہوئی آئی اور بچے کے سرہانے بیٹھ کر اُس کے ماتھے کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔ بوڑھا کھاٹ کے ایک بازو پر کہنیاں دھرے کریم کے اُبھرتے اور بیٹھتے سینے کو ٹکٹکی باندھے گھورنے لگا۔ کریم اب اتنا بے قرار نظر نہ آتا تھا۔ بڑھیا ہولے ہولے پھٹی پھٹی آواز میں گنگنانے لگی: "الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔۔۔"

بوڑھے کے ہونٹ بھی ہلنے لگے اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اور پھر ایک ساتھ دونوں نے کریم کے ماتھے پر "چھو" کی۔ کریم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور بوڑھا جوڑا خوشی سے لرزنے لگا جیسے انہوں نے اپنے لال کو آبِ حیات کا ایک مٹکا پلا دیا ہے!

کریم کی آنکھ لگ گئی۔ بڑھیا آہستہ سے اُٹھ کر دہلیز پر آ بیٹھی۔ اور بوڑھا پیچھے کھسکتا ہوا دیوار سے لگ کر اونگھنے لگا!

دو سال سے بوڑھا کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔ اور دو سال سے اُن کا نوجوان بیٹا کریم چھکڑا چلاتا تھا۔ گاؤں سے قصبے تک اُسے چونی مل جاتی تھی۔ اور پھر ہفتے میں دو تین بار تو قصبے کے سیٹھ اُسے ضرور بلا لیتے تھے۔ مہینہ بھر سے بوڑھے والدین کو کریم کی شادی کی فکر پڑ گئی تھی۔ اِسلئے کھانے کے بجائے بچانے میں اُنہیں مزا آنے لگا۔ ماں باپ کا یہ نیا شوق دیکھ کر کریم بھی لمبے لمبے سفروں پر جانے کے لئے تیار ہو جاتا۔ بڑھیا پرسوں گرتی پڑتی گاؤں میں ایک لڑکی کے متعلق بات بھی کر آئی تھی اور اُسے لڑکی کے والدین کی باتوں میں اُمید کی جھلکیاں نظر بھی آ گئی تھیں۔ کیونکہ جب واپس آئی اور بوڑھے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا "بولے اب بتا بھی۔ منہ اٹھائے کدھر بھاگی جا رہی ہے؟" تو وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی: "میں دو نفل شکرانے کے

پڑھلوں، پھر بتاؤں گی سارا حال۔" بوڑھے کو وفورِ مسرت میں کھانسی چھوٹ گئی اور وہ زمین پر زور زور سے تھوکتے ہوئے بولا۔" توبہ میری، اے توبہ —— شکر ہے شکر ہے میرے مالک۔ اخ تھو! شکر ہے —— توبہ میری!"

کل شام سے کریم کو بخار آرہا تھا۔ سارے گاؤں میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر سے "بنفشے" کے کاڑھے کی بو آتی تھی اور لوگوں کو چائے کی چسکیاں دیتے دیتے ذیلدار تنگ آگیا تھا۔ دکانداروں نے سونف اور گلقند کا بھاؤ چڑھا دیا تھا۔ بوڑھے نے بھی پرانے میلے چیتھڑوں میں بندھی ہوئی جڑی بوٹیوں کو کھول کر "پھنکی" بنائی اور کریم کو کھلا دی مگر اُسے ایسا بخار چڑھا کہ اُس کے جسم سے گز گز بھر کے فاصلے سے تپش محسوس ہوتی تھی پہلے تو دیوانے ہو گئے دونوں۔ بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ گرتے پڑتے۔ تکنے لگتے اور بڑبڑاتے جاتے:" اب کیا کیا جائے۔ اب کیا ہوگا! نبض کیسے چل رہی ہے سانس کیسے آرہی ہے؟ ماتھے پر پسینہ آگیا کیا؟ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے؟ طبیعت متلا رہی ہے اس کی؟ اب کیا ہوگا؟"

لیکن آدھی رات کو کریم کا بخار ہلکا ہوا تو جان میں جان آئی۔ البتہ نیند نہ آئی۔ بوڑھا کھانستے کھانستے بحال ہو گیا کسی نے اچانک زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کریم کی آنکھ لگ رہی تھی۔ بھڑک کر اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ بوڑھا چلا کر بولا:" اے کون ہے اس وقت؟ کیا کام ہے؟ دہلا دیا میرے بچے کو!"

باہر سے ایک کرخت آواز آئی:" اے بوڑھے۔ ملک جی کہہ رہے ہیں۔ آج سو گے بھی یا یونہی کھانستے اور کھنکارتے رہو گے۔ تمہاری کھانسی نے محلے بھر کی

نیند حرام کر رکھی ہے۔ ملک جی کروٹیں بدل رہے ہیں شام سے! کہتے ہیں بوڑھے کہو اتنا زور سے نہ کھانسے۔"

"مجال ہے حضور۔ مجال ہے میری۔ کہ کھ کھوں۔ . . . . . . (منہ میں کپڑا ٹھونس کر) مجال ہے مجھ غلام کی۔"

کریم نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کون تھا؟"

بڑھیا بولی "ملک جی نے تمہارا حال پوچھ بھیجا ہے۔"

کریم نے دو ایک بار آنکھیں جھپکائیں اور بند کر لیں —— ملک جی اُن کے پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ قصبے میں اُن کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ذرا بددماغ واقع ہوئے تھے۔ ایک بار صاحب بہادر دورے پر تھے۔ ملک جی کے آگے بوڑھے نے ہاتھ جوڑے کہ بالشت بھر زمین پر اُگتا تو خاک نہیں۔ لگان کہاں سے ادا کروں لیکن انہوں نے یہی رٹ لگاتے رکھی کہ "صاحب بہادر کے سامنے پیش کر دوں گا۔ وہ حوالات میں بند کر کے نکال لیں گے پیسے تیری گڑی ہوئی تجوری سے۔ سرکار اپنی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑنی، تجھے؟ تو تو سٹھیا گیا ہے۔!

اور واقعی ملک صاحب نے صاحب بہادر کے سامنے بوڑھے بڑھیا کو پیش کر دیا۔ صاحب بہادر کو بھی بوڑھے نے وہی جواب دیا تو انہوں نے اپنی پتلی چھڑی سے بڑھیا کی بالیاں چھوتے ہوئے کہا۔

"ول انہیں بیچ ڈالو۔ سرکار پیسہ نہیں چھوڑے گا۔ سرکار کا پیسہ تم نہیں رکھو! سرکار جیل بھیج دے گا۔ سرکار سزا دے گا۔ سمجھا تم لوگ؟ ایں؟

صاحب بہادر نے بڑھیا کی بالیاں کیا چھوئیں۔ بوڑھے کے کلیجے پر انگارہ

دھر دیا۔ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ بڑھیا کو اشارہ کیا۔ اُس نے بالیاں نوچ کر صاحب بہادر کے قدموں میں ڈال دیں اور دونوں گھر چل دیئے۔ بیڑا ادا ہیا ہے یہ اولڈ ڈاگ"۔ صاحب بہادر سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے لیکن بوڑھے کے دل میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا تھا۔ ابل کھاتا جا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا: "بڑا آیا صاحب بہادر بن کر وہاں سے! گاؤں بھر کے سامنے بالیوں پر چھری پھیرنے لگا۔ حاکم تھا۔ ورنہ کمبخت کی یوں گردن اینٹھتا کہ صاحب بہادری دھری رہ جاتی۔ پیسے کی خاطر میری عزت پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اونہہ!"

اور بڑھیا بیچاری نے بھی وہ رات روتے بسورتے گزار دی۔

ملک جی نے اُس دِن سے اُس گھر سے مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر اب اتنا کرم کرتے تھے کہ کبھی کبھار کریم کو بلانے آنکلتے اور وہ دن بھر سر ٹیک کر چونّی کما لاتا۔

آج پھر بوڑھے کریم پر بخار نے پھر حملہ کیا۔ ایک بار درد کی بھی شکایت کی۔ مگر بوڑھے کی پھٹکی آڑے آگئی۔ دوپہر کو بخار کچھ ہلکا ہوا تو بوڑھا باہر آن بیٹھا تھا کہ بڑھیا کے کہنے پر پھر اندر جانا پڑا۔

اب کریم سو رہا تھا۔ بوڑھا دیوار کا سہارا لیتا بڑھیا کے پاس جا بیٹھا اور بولا "کتنی رقم ہو گئی؟ ہنسلی بن جائے گی؟ کڑے بھی تو بنوا لے ہیں! اور سُنا ہے ہماری بہو شلوار پہنتی ہے گھیرے والی۔ کوئی اچھا سا بھڑکیلا کپڑا خرید لو شلوار کے لئے۔ یہ جو نئے نئے کپڑے نکلے ہیں! ان ہی میں سے چھانٹنا دیکھیو۔ حرف نہ آئے میرے لال کی جوانی پر۔ اسی کی کمائی ہے۔ اسی پر خرچ ہو تو ہمیں کیا۔ ہمیں تو خوشی ہے ہمیں دو وقت کے کھانے سے غرض ہے۔ سو کچھ کمی نہیں' اللہ کا فضل ہے!"

بڑھیا بولی "ساڑھے بارہ روپے ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ روپیہ دوا دارو اور گھنگھنیوں پر خرچ آیا۔ پانچ آنے کی شکر بھی لائی تھی۔ اچھا ہو کر اور کما لائے گا میرا لال۔ ادھر ملک جی سے کچھ مانگا ہوتا۔"

"اُلٹا جو تا دکھاتے ہیں ملک جی۔ لگان والی بات یاد ہے؟"

بوڑھی کے کانوں کی لویں لرز گئیں۔ جن میں ایک ایک کھلا سوراخ جیسے پرانی یاد کو تازہ کر رہا تھا۔!

کچھ دیر کے بعد بڑھیا اندر گئی اور پھر ہاتھ نچاتی باہر آ کر بولی "اتر گیا بخار، چہرے پر رونق آ رہی ہے۔ اب اچھا ہو جائے گا۔"

بوڑھا اکڑوں بیٹھ کر تھو کتے ہوئے بولا "بھنکی کی کرامات ہے یہ۔ تین دن ہوئے نورے کے اونٹ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ گڑ میں ملا کر یہ بھنکی کھلائی تو اٹھ کر اسی وقت بھاگنے اور ڈکرانے لگا۔ بڑے بوڑھوں کی ٹوٹکیاں اکسیر ہوتی ہیں۔"

دونوں اندر کریم کے پاس چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس کی ماں بہت دیر تک اس کے شانے اور پیٹھ سہلاتی رہی۔

چراغ جلے ملک جی آ دھمکے۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ بوڑھے نے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا۔ بڑھیا پریشانی میں ہاتھ ملنے لگی۔ اور کریم چارپائی پر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ملک جی بولے "کیوں؟ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"بخار ہو گیا ہے اِسے!" بڑھیا بولی۔

"اب کیسا ہے؟"

"جی اچھا ہوں اب تو۔"

"اب اچھا ہے جی۔" بوڑھا منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے بولا۔ "اب اچھا ہے ورنہ ہم تو نا اُمید ہو بیٹھے تھے۔ قرآن شریف کے ختم کے ارادے کر رہے تھے ہم تو۔"

ملک جی بولے "جنگ کی وجہ سے گیہوں کا نرخ چڑھ گیا ہے نا۔ اس لئے میں آج سو بوریاں قصبے میں بھجوانا چاہتا ہوں۔ صبح صبح وہاں پہنچ جانی چاہئیں۔ کریم اگر آسکے تو آج رات چھ آنے ملیں گے۔"

"توبہ!" بوڑھا بولا۔ "یہ کیسے آسکتا ہے جی۔ یہ تو بڑی مشکل سے اٹھا ہے اب۔"

بڑھیا بلبلا اُٹھی۔ "سانس لینا بھی دوبھر ہے اسے۔ بہت کمزور ہے جی۔"

"مَیں اچھا ہوں۔" کریم بولا۔ "میں چلوں گا قصبے میں کس وقت چلنا ہوگا؟"

ملک جی بولے۔ "ابھی دوسرے چھکڑوں والے تو لاد بھی چکے ہوں گے۔"

"تو میں آیا!"

ملک جی چلدیئے۔ بوڑھے اور بڑھیا نے کریم کی منتیں کیں کہ اِس حالت میں چھ آنے کے لئے سرد رات میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں لیکن کریم بولا "کمبل اوڑھ لونگا۔ آخر ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر یوں آرام کرنے لگے تو پیٹ کیسے بھرے گا اور ہنسیاں کرتے اور شلواریں کیسے بنیں گی؟ مَیں صبح سویرے پلٹ آؤں گا گھر کو۔ چائے بھی لے آؤں گا قصبے سے اور کچھ ضرورت ہوگی؟"

کریم اُٹھا۔ بوڑھا جوڑا پریشان اور حیران اُسے دیکھتا رہا۔ کریم نے کمبل اوڑھا چہرے پر پگڑی کا ایک پلو پھیلا دیا اور باہر آکر چھکڑے کے آگے بیل لگا دیئے۔

بوڑھا بولا "دیکھ رہی ہے ری؟ شادی کی خوشی میں جان کی پروا نہیں کرتا۔"

"ہاں کل کہہ رہا تھا ہیں کوڑی کوڑی اکٹھی کر دوں گا۔ پر تمہیں دم بھر کیلئے بھی کسی کا محتاج نہ ہونے دوں گا۔ اُسے اپنی شادی کی اتنی فکر نہیں جتنی ہماری فکر ہے۔"

"لے تو کیا جانے۔" بوڑھا بولا؛ "تو نہیں جانتی۔ دیکھو وہ چلدیا۔ یا الٰہی خیر۔"

"فی امان اللہ۔ اُف کتنی سردی ہے۔"

"توبہ میری!"

چھکڑوں کی قطار کچی سڑک پر چرچراتی ہوئی چلی تو پیچھے بعد دیگرے سب چھکڑے والے کریم کو کوسنے لگے "اے باگ ہلا، ورنہ پیچھے ہٹ آ ہمیں تو راستہ دے۔ کیا ٹخ ٹخ لگائے جا رہا ہے؟ سو رہے ہیں تیرے بیل؟ پیچھے ہٹ آ۔"

اور اس طرح پیچھے ہٹتے ہٹتے کریم قطار کے آخری سرے پر پہونچ گیا۔ تمام چھکڑے والے کریم سمیت بوریوں پر لیٹے جا رہے تھے۔ اور اندھیری رات پہیوں کی بھیانک چیخوں سے گونج رہی تھی۔

صبح کو دن چڑھے ملک جی غصّے سے لال پیلے بوڑھے کے پاس آئے اور چلا اُٹھے "کدھر گیا وہ تمہارا لاڈلا۔ کہاں پھینک آیا میری بوریاں۔ اُس کے ساتھی قصبے سے ہو کر آ بھی گئے کب کے۔ اور وہ ابھی تک وہاں نہیں پہونچا۔ گھر میں تو سب کچھ نہیں ڈال گیا؟"

—— اور ملک جی اندر آ کر چارپائیوں کے نیچے جھانکنے لگے "کدھر مر رہا وہ بدمعاش۔"

بوڑھا کانپتے ہوئے بولا "وہ جی بس رات کو نکلا تھا سب کے ساتھ۔ پھر واپس نہیں آیا اب تک۔"

بڑھیا بولی "سودا خریدنا تھا قصبے میں! ابھی واپس آ جائیگا۔"

"مگر میری بوریاں کیا ہوئیں ؟" ملک جی زور سے فرش کو ٹھکراتے ہوئے گرجے!

اچانک بوڑھا چلاّ اُٹھا" وہ رہا ہمارا چھکڑا!"

"بوریوں سمیت" بڑھیا ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"اور بادشاہ سلامت سو رہے ہیں اوپر۔ خدا جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹ کر آرہے ہیں بل" ملک جی بولے۔

لوگ چھکڑے کی طرف جھپٹے۔ بوڑھا جوڑا بھی اُن کے عقب میں رینگتے ہوئے جانے لگا۔

"اے حضورِ عالی۔ اے ملک کریم خاں جی۔ اُٹھو جی" ملک جی کریم کا لٹکا ہوا بازو ہلا کر بولے۔

اُن کا ایک ملازم آگے بڑھا اور کریم کے چہرے سے کمبل کھینچ کر پکارا" اے کریو۔ اُٹھو بھی۔ ایسی بھی کیا نیند ہوئی کہ۔۔۔۔"

اے ذرا دیکھنا اوپر چڑھ کر" ملک جی بولے یہ کیا ہو گیا اسے"

ایک شخص چھکڑے پر چڑھ گیا۔ کریم کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں اور تھکی ہوئی آنکھیں بڈی کے پرانے بٹنوں کی طرح بے نور تھیں۔

ملک جی ناک پر رومال پھیلاتے ایک طرف ہو کر بولے "مر گیا ہے"

دور بوڑھا بڑھیا کا ہاتھ تھامے پکار رہا تھا" اے ذرا تیز چل۔ تیری آواز سے جاگ اُٹھے گا وہ۔ قدم تک نہیں اُٹھا سکتی تو! توبہ میری!"

بھُوت

جب بھیگی ہوئی شاموں کو چڑیوں کے قافلے ہواؤں کو چیرتے ہوئے دُور پھیکے پھیکے اندھیرے میں گم ہو جاتے اور جب چولھوں اور تنوروں سے نکلا ہوا دھواں گہرا بادل بن کر گاؤں پر چھا جاتا تو ولی سر جھکائے گھر سے باہر نکلتا۔ اور سرسبز کھیتوں کے گھاس سے ڈھکے کناروں پر سے ہوتا ہوا سرکاری ذخیرے کے اس حصے میں پہنچ جاتا جہاں دن کو بھی حواس قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ فلک بوس سیاہ چوٹیاں، گہری خوفناک گھاٹیاں، گنجان جھاڑیاں، جن میں سے اکثر سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں آتی تھیں اور کئی راتوں کو تو چرواہوں نے موسلا دھار بارش میں بھی ان گھاٹیوں میں دئے جلتے دیکھے تھے۔ لیکن ولی کے قدموں میں نہ کوئی ہچکچاہٹ ہوتی۔ نہ اس کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی نظر آتی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے سست سست

قدم اُٹھاتا بڑھتا جاتا۔ گویا برسوں سے انہی راہوں پر چل پھر رہا ہے۔ وہ اُن دشوار گذار پہاڑیوں پر سے نہایت آسانی سے نیچے اُتر جاتا۔ گول گول پتھر اُسکے قدموں کے نیچے جم کر رہ جاتے۔ وہ نیچے اُتر کر ایک چشمے کے کنارے بیٹھ جاتا۔ اور دردناک سروں میں ایسے دُکھ بھرے گیت گاتا کہ آس پاس کی پہاڑیاں گونج اُٹھتیں اور کالی چوٹیوں کے کنارے پر ننھے ننھے ستارے شدتِ درد سے اِس زور کے ساتھ کپکپاتے جیسے ابھی لپک کر اس گھاٹی میں آ رہیں گے۔ اِن گھاٹیوں کے اردگرد رہنے والے دہقانوں نے ولی کے ان گیتوں کو بھی کسی غیر مرئی مخلوق کی دل لگی پر محمول کیا۔ اور پندرہ بیس دن کے بعد تو گاؤں بھر میں اس عجیب و غریب رُوح کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں جو آدھی آدھی رات تک علاقے کی زبان میں ایسے ایسے شعر کہتی ہے ...... کہ ......

(اور یہاں وہ اپنے روائتی مبالغے سے کام لیتے)...... چشموں کا پانی اُبلنے لگتا ہے۔ آس پاس چراغ جلنے لگتے ہیں۔ درختوں کی چوٹیاں جھک کر زمین کو چھونے لگتی ہیں ——— گھنگھروں کے جھنجھنانے کی آوازیں آتی ہیں۔ آسمان سے جو ستارا ٹوٹتا ہے۔ وہ اُدھر ہی کا رُخ کرتا ہے!

گاؤں سے یہ باتیں نکل کر سارے علاقے میں پھیل گئیں۔ اور کچھ دن کے لئے چوپال پر انہیں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی رہیں!

لیکن ولی نے اپنے دُکھے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یہ خوفناک جگہ صرف اِس لئے تجویز کی تھی۔ کہ یہاں وہ اپنی زندگی کی چند سنہری گھڑیاں گزار چکا تھا اور یہاں اُسے دُنیا کے جھوٹے دردمند اور رسمی غمخوار نہیں ستا سکتے تھے۔ یہاں وہ جی کھول کر خدائے سمیع و بصیر کے حضور میں وہ فریاد بے کھٹکے پیش کر سکتا تھا۔ جو دن کے وقت

اس کا دم گھونٹ لیتی تھی۔

اپنے آپ کو بے درد لوگوں سے محفوظ رکھنے اور اُن کے شکوک اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اُس نے دو چار موم بتیاں بھی خرید لیں۔ ایک دو گھنگھرو بھی جیب میں ڈال لئے۔ اب وہ گھاٹی میں چشمے کے کنارے موم بتیاں جلا دیتا۔ کبھی کبھی گھنگھروؤں کو ہلا دیتا اور خود کسی چٹان کی اوٹ میں بیٹھا گیت گاتا رہتا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھتا اور پھر موم بتیاں بجھا کر اور گھنگھرو وہیں کسی جھاڑی میں چھپا کر واپس گاؤں آجاتا۔

ایک رات اُسے رستے میں گاؤں کا بوڑھا چوکیدار مل گیا۔ بوڑھے نے زور سے پوچھا: "خبردار! کون ہے تو؟"

اُس نے آہستہ سے کہا: "ولی محمدؐ۔"

بوڑھا نزدیک آکر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا: "مگر بیٹا ایسی اندھیری رات میں کدھر نکل گئے تھے؟ تم نے سُنا نہیں سرکاری ذخیرے کی پورب والی گھاٹیوں میں آج کل جنات نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک بتیاں جلتی ہیں۔ گیت گائے جاتے ہیں۔ ناچ ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں گاؤں میں بھی کئی بار اُن کے گھنگھروؤں کی آواز سنی ہے۔ آج کل علاقے پر بڑا بھاری وقت آیا ہوا ہے۔ ہوش سے چلا پھرا کرو کہیں کوئی بھتنا تمہیں دبوچ نہ لے۔ بڑی ظالم مخلوق ہوتی ہے یہ۔ راہ چلتے کو چھیڑتے ہیں اور پھر گردن مروڑ کر دم لیتے ہیں۔"

ولی نے جواب دیا: "باباجی! مجھے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔ میں اُس کے سوا اب کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

بوڑھا زور سے کھنکارا اور ولی کے اس عجیب و غریب عقیدے پر تعجب کا اظہار

کرتا ہوا ایک گلی میں مڑ گیا۔

گھر والے اس کے کھوئے کھوئے انداز اور سوئی سوئی آنکھیں دیکھ کر پریشان رہنے لگے۔ اس کی نوجوان بیوی آدھی آدھی رات تک جاگتی رہتی۔ اور جب ولی واپس آتا تو پوچھتی "تم آج پھر دیر سے آئے؟ آخر چوپال والوں کو گپیں ہانکنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا؟"

اس کی بوڑھی ماں بھی جاگ اٹھتی اور کہتی "بیٹا! آج کل بھوتوں نے علاقے میں اودھم مچا رکھا ہے، اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو۔"

اس کا ننھا سا بچہ بھی آنکھیں ملتا غوں غوں کرتا اٹھ بیٹھتا۔ جیسے اپنی توتلی زبان میں باپ سے اس رویے کی وجہ پوچھ رہا ہے۔

ولی ان سب کا جواب ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے دیتا۔ اور دھم سے کھاٹ پر دراز ہو جاتا۔

ایک شام کو ذخیرے میں جانے سے پہلے وہ گاؤں کے عین وسط میں ایک تنگ و تاریک گلی میں سے گزرا۔ اس گلی میں چماروں کے تین چار گھر تھے جن سے ہر وقت کچے چمڑے اور گلی سڑی کھالوں کی بدبو آتی رہتی تھی۔ ان میں سے ایک گھر بالکل ویران پڑا تھا۔ دالان میں چند صاف اور چوکور پتھر پڑے تھے۔ جن پر چمار چمڑا کوٹتے تھے اُن پر آدھ آدھ انچ گرد جمی ہوئی تھی۔ سرکنڈوں کا چھپر بارش کی وجہ سے نیچے جھک آیا تھا صحن میں گاؤں کے آوارہ کتے کھیل رہے تھے۔ اور کوٹھے کی منڈیروں پر بے شمار گلہریاں اپنی پھولی ہوئی دمیں اٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ولی اُس مکان کے قریب آ کر رکا، اندر جھانکا۔ حیران کھڑا رہا۔ جیسے کوئی ملاح اپنی کشتی

ڈبو کر کنارے پر بیٹھا اپنے تاریک مستقبل میں امید کی کرن ڈھونڈھنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ صحن کے بوسیدہ چوٹھوں کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور پھر وہاں سے نکل کر سرکاری ذخیرے کو چل دیا۔ جس کے اردگرد دو دو تین تین کوس کے فاصلے پر بھولے دہقان دیوں کے جلنے بجھنے، گیتوں کے گائے جانے اور گھنگھروں کی جھنکار کے منتظر تھے۔

اور اب اُس گلی کے چکّر کاٹنا بھی اُس کا معمول ہوگیا۔

جب وہ نامراد انسان کے خیالات کی طرح بل کھاتے رستے پر چڑھنے لگتا اور ننھے ننھے کنکر اُس کے قدموں تلے سے کھسک کر نیچے لڑھکتے اور جب درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے اُس کی پگڑی اُلجھ جاتی اور وہ اُسے چھڑانے کے لئے رُک جاتا۔ پھر جب درخت کی شاخوں کو ہلتا دیکھ کر آشیانوں سے چیلیں پھڑپھڑاتی ہوئی نکلتیں۔ اور دور کسی چٹان یا اونچے درخت سے ٹکرا کر نیچے گر جاتیں۔ تو فضا ایسی ہیئت اختیار کر لیتی جیسے ہر طرف ارواحِ خبیثہ کی بادشاہی ہے اور جیسے ان درختوں کی آڑ میں بھتنے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں اور کھیلتے کھیلتے ہواؤں میں اُڑ جاتے ہیں اُوکی کو لوگوں کے اس شبہ کو یقین میں بدلتے دیکھ کر کچھ نہ کچھ روحانی تسکین حاصل ہوتی کیونکہ دوسرے لوگوں کے احساسات سے کھیلنے کی لذت مرنے والے انسان کے دل میں بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ واپس گاؤں آتا۔ اور چوپال کی چھت پر سے کسی نوخیز لڑکے کے گانے کی آواز آتی ؎

اجے نہیں سن پھلیاں پھلیاں ماہی توڑیاں ساڈیاں کلیاں[1]

---

[1] ابھی تک ان میں پھول پھل نہیں آئے تھے۔ ساجن نے میری آس کی کلیاں (قبل از وقت) توڑلیں۔

تو اُس کے دل سے کچھ ایسی دردناک ہوک اُٹھتی کہ وہ سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بیٹھ جاتا، اور سر نہ اُٹھاتا، جب تک اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے بہتے ختم نہ ہو جاتے!

جب وہ آنکھیں بند کر کے اپنے سرد بستر پر لیٹتا تو اُس کی نظروں کے سامنے اندھیرا ایک خاص شکل اختیار کر کے ناچنے لگتا۔ وہ دیکھتا کہ اندھیرے کا سیلاب ایک وسیع دائرے میں تبدیل ہو گیا ہے اور یہ دائرہ حرکت میں ہے۔ اندھیرے پردوں کے پیچھے بانسریوں کی دھیمی دھیمی لہریں بلند ہو رہی ہیں۔ اس اندھیرے سے بھی ایک گہرا سایہ بانسریوں کی آواز میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ ابھرتا اور اس دائرے کے کچھ اس تیزی سے چکر کاٹتا کہ آسمان و زمین لامحدود فضا میں لڑھکتے محسوس ہوتے۔ یہ اندھیرا سایہ چکر کاٹتا، ناچتا، گاتا، بڑھنے لگتا۔ بڑھتا جاتا۔ بڑھتا جاتا۔ حتےٰ کہ اس کا سحر اس کے سارے احساسات پر چھا جاتا۔ وہ آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھتا۔ آسمان پرستار انسان کی بے بضاعتی اور مضحکہ انگیز خیال آرائی پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ اور وہ فضا میں اس طرح ہاتھ گھمانے لگتا، جیسے وہ کسی ٹھوس جسم کو چھونا چاہتا ہے۔!

دن کو بیلوں کے پیچھے چلتے ہوئے جب ہل کی پھال سے کوئی جنگلی پھول کٹ کر پرے جا گرتا۔ یا کوئی کیڑا مضطرب ہو کر کسی سوراخ سے نکلتا اور اپنا ننھا سا سر اٹھا کر اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کرنے لگتا تو وہ بیلوں کو اس قدر پیٹتا کہ ان کی کمریں سوج جاتیں۔ وہ اُن کی پیٹھ پر شیشم کی پتلی چھڑی جماتے ہوئے کہتا یہ کمبختو، ذرا ادھر سے ہو کر گزر جاتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ ابھی اس ننھی اودی کلی نے دُنیا کا دیکھا ہی کیا تھا کہ تم نے اس کو مسل کر خاک میں ملا دیا۔ اور اس ذرا سی جان نے تمہارا کیا قصور کیا تھا کہ اس کا

گھر برباد کر کے آگے بڑھے جا رہے ہو——!"

آس پاس ڈھیریوں پر چروا ہے ولی کو اپنے آپ سے باتیں کرتا سنتے تو اکٹھے ہو جاتے اور دبی دبی آواز میں کہتے: "ارے ولی کس سے بول رہا تھا؟"

بیلوں سے!"

"پاگل ہو گیا ہے!"

"بیمار ہے بیچارا!"

"پیر جی کے سلام کو نہیں جاتا!"

"نماز نہیں پڑھتا!"

"نقصان اُٹھائے گا"

"مر جائے گا!"

اگرچہ ولی ان کی باتیں نہ سُن سکتا۔ لیکن اُن کو یوں سر جوڑے بیٹھا دیکھ کر اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور انہوں نے اس کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔

ایک روز وہ سویرے ہی ہل چلا کر گھر آ گیا۔ اور دل بہلانے کے لئے چوپال پر چلا گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کے متعلق بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ولی کو دیکھ کر ایک سفید ریش بزرگ بولا: "ولی آ رہا ہے، اُس سے پوچھو، چوکیدار کہہ رہا تھا کہ اکثر کالی راتوں کو ولی گاؤں کے باہر دور دور تک چکر کاٹتا رہتا ہے اور نہیں ڈرتا۔ کیا اُس نے بھی کبھی کچھ دیکھا یا سنا؟"

ولی ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور بولا: "لوگوں سے تو یہ قصہ سُن رکھا ہے لیکن نہ اپنی

آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے نہ کانوں سے کچھ سنا ہے۔ اگر کہو تو آج رات گھاٹی میں جا کر اس سارے "اسرار" کا حال معلوم کر آؤں۔ اگر کچھ چیز ہوئی تو مجھے دکھائی تو دے گی۔ ورنہ مفت میں مسافروں کو گھاٹی کے اُس طرف روکے رکھنا اور گھروں سے ڈر کے مارے باہر قدم نہ دھرنا بہت بُری بات ہے۔"

بڑے بوڑھوں نے اُسے ایسے خوفناک اقدام سے روکا۔ اُس کے دوستوں نے اُس کی اس جرأت پر اظہارِ تعجب کیا اور سارے چوپال والے حیران ہونے لگے کہ انسان بھوتوں سے لڑنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہے!

ایک بوڑھا بولا "بیٹے ولی! اس مخلوق سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی بھوت نے ہنسی مذاق میں ایک تھپڑ جما دیا تو مرتے دم تک چین نہ پاؤ گے۔ کسی نے بڑھ کر گردن اینٹھ دی تو ان لوگوں کا کیا بگڑے گا۔ ایک جوان بیوی کو بیوہ اور ایک معصوم بچے کو یتیم کر جاؤ گے۔ ایسا نہ کرنا۔ وہ بھوت ہم انسان، وہ آگ ہم خاک۔ ہمارا اُن کا کیا مقابلہ۔"

لیکن ولی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔ وہ گھر واپس آیا۔ اُس کی بوڑھی ماں اور نوجوان بیوی نے اُس کے ہاتھ جوڑے منتیں کیں کہ اُدھر نہ جانا۔ ڈائنیں کلیجہ نکال کر چبا جاتی ہیں اور پھر مرنے والے کے گھر پر دھاوا بول دیتی ہیں لیکن ولی انکار کرتا رہا۔ وہ جی ہی جی میں لوگوں کی اس غلط فہمی پر مسکراتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ ایک دو راتیں یہ سوانگ بند رکھے گا اور لوگوں کا تعجب بڑھانے کے لئے پھر یہی سلسلہ چھیڑ دے گا۔ وہ اپنے غمزدہ دل کو ان لاحاصل مصروفیتوں میں ڈال کر بہلانا چاہتا تھا۔

اُس شام وہ گھر سے نکل کر چماروں والی گلی کی طرف جانے لگا تو چوپال کے قریب اُسے ایک نوجوان ممّوں ملا۔ اُس نے پوچھا "ابھی تک نہیں گئے ولی؟ بھوت تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

ولی صرف مسکرا دیا۔

ممّوں بولا "بھئی مذاق کی بات نہیں اُدھر نہ جانا۔ اب یہ فتّو چمار کی لڑکی کا قصّہ تو تم نے سنا ہوگا۔ لوگوں نے اُسے بھی آدھی آدھی رات کو اُس ذخیرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک روز ذرا دیر سے آئی اور بیمار پڑ گئی۔"

ولی نے کہا "لیکن اُسے صرف بخار ہوا اور پھر بد پرہیزی سے بڑھ گیا۔ اب چار ماہ سے سارا کنبہ جو لاہور کے بڑے ہسپتال میں ہے تو کسی امید پر ہی بیٹھا ہے نا۔ امید ہے چمارن اچھی ہو کر آئے گی۔"

ممّوں نے متعجب ہو کر کہا "اچھی ہو کر آئے گی! —— تمہیں ابھی تک معلوم نہیں کیا؟ چمار ابھی ابھی چوپال سے دس بارہ آدمی بلا کر لے گئے ہیں۔ اسٹیشن پر چمارن کی لاش آئی ہوئی ہے، وہ اُسے اُٹھانے گئے ہیں۔"

ولی کے لبوں سے ایک پھنکار سی بلند ہوئی "اوہ بیچاری —— مر گئی!"

وہ سر جھکائے خاموش سیدھا ذخیرے کی طرف چل دیا۔

ساری رات لوگ اُس کی واپسی کے منتظر رہے۔ اُس رات نہ بتیاں جلیں نہ گیت گائے گئے۔ نہ کنکر لڑھکے نہ چیلیں اڑیں۔ نہ گھنگھرو جھنجھنائے اور نہ ناچ ہوا۔ ایک اُداس سا سنّاٹا ہر طرف منڈلاتا رہا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی ولی کی ماں اور بیوی کی چیخ پکار سے مجبور ہو کر دس بارہ نوجوان گھاٹی کی طرف دوڑے جب وہ

چوٹیوں پر پہونچے اور نیچے گھاٹی میں جھانکنے لگے تو دور بہت نیچے چشمے کے کنارے انہیں ولی کا بے حس و حرکت جسم نظر آیا ——— اور گھاٹی میں خاموشی گونج رہی تھی!

"ولی، ولی، ولی محمد۔ او ولی محمد! ———" وہ چیخنے لگے۔ اور آس پاس بھیانک سیاہ چٹانیں اُن کی آوازیں دہرانے لگیں۔ بھوت ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑی پر سے ایک چڑیا اڑی اور چشمے پر پانی پینے لگی۔ پھر اڑ کر ولی محمد کے پیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھدکتی پھری، ناچتی رہی اور آخر پھر سے اُڑی اور اوپر ہی اوپر اُٹھنے لگی۔ نوجوان "بھوت، بھوت" پکارتے پاگلوں کی طرح گاؤں کی طرف بھاگے اور جب چوپال پر پہونچے تو دور سے انہوں نے ایک مجمع دیکھا۔ جو چمارن کی لاش اٹھائے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا ———!

ننھّے نے سلیٹ خریدی

ننھّا عزیز سر پر ایک غلیظ سا بستہ رکھے تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہولے ہولے گنگناتا جا رہا تھا ؂

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

اُس نے اچانک قدم روک لیئے اور زمین کو بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا پھر بستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر دیکھا —— ہلکا نیلا آسمان جس پر دو چار چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ پہ حیرت نے فتح پالی۔

کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا!!

وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا ہوا قدم اٹھانے لگا۔ ایک دو بار مویشیوں کے گاؤں نے اُسے تکلیف دی اور وہ ایک طرف دیوار سے چمٹ کر ہر بیل کو خوف سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اچانک اُس کی نگاہیں ایک جوان بیل کے سُم ایسے سفید سموں پر جم گئیں اور پھر اُس نے اپنے میلے کچیلے پاؤں کی طرف دیکھا جو پُرانی چپل میں مردہ روحوں کی طرح پڑے تھے ——— میل سے بھرے ہوئے بے جان اور بدصورت! اُس کے ذرا سے دماغ نے ایک بہت بڑی تجویز سوچی — اگر مجھے اللہ میاں کہیں ملیں تو میں پہلے اُنہیں سلام کر کے (کیونکہ ماسٹر جی نے بڑوں کو سلام کرنے کی زبردست تلقین کر رکھی تھی) یہ عرض کروں گا "اچھے اللہ! انسان کے پاؤں بڑے خراب ہیں۔ انسان چلتا پھرتا ہے۔ بھاگتا دوڑتا ہے۔ تو اُس کے پاؤں میں کنکر کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ مَیل جم جاتا ہے اکئی بار زخمی ہو جاتے ہیں پاؤں ——— اگر یہ بیلوں کے سموں کی طرح ہڈی کے بنے ہوتے ہوں تو کیا ہرج ہے!"

——— وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اُسے گاؤں کا سب سے بڑا رئیس مشکی گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اُس کی گرگابی سورج کی شعاعوں میں شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ اور جب وہ عزیز کے پاس سے گزرا تو آپ سے آپ عزیز کی نگاہیں اُس کے پاؤں پر جم گئیں جو دودھ کی طرح سفید تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے خدا سے اپنی غلط دعا واپس مانگ رہا ہے ——— اتنے اچھے ایسے صاف پاؤں! سُم کیا شے ہے ان کے مقابلے میں! مگر میں بھی تو ایک انسان کا بیٹا ہوں۔ میرے پاؤں اتنے غلیظ کیوں ہیں! یہ اُلٹی بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

وہ اِس سوچ میں غرق آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ اچانک اُسے رستے میں اُبھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی بستہ اُچھل کر دور کنکروں پر جا گرا اور اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے خون جاری ہو گیا۔ اُسے پھر ایک ثانیہ کے لئے بیل کے سموں کے فوائد کا خیال آیا مگر درد کی شدت نے اُس کے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ اُس نے چیخ کر رونا چاہا مگر سامنے اسکول کے برآمدے میں ماسٹر جی کھڑے ہاتھوں میں کھریا مٹی کا ایک ٹکڑا اچھال رہے تھے۔ اُس کی چیخ حلق تک آئی اور وہ کڑوی دوا کی طرح آنکھیں بند کر کے پی گیا۔ زخم پر مٹی ڈال کر اُٹھا۔ بستے کو چھوا تو اُس کا دل دھک سے اُس کی ایڑیوں میں جا گرا ——— اُس کی سلیٹ ٹوٹ گئی تھی۔

وہ ضبط نہ کر سکا اور پورے زور سے رونے لگا۔ ماسٹر جی بڑے رحم دل تھے۔ دوڑے دوڑے آئے۔ ننھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا "بچے! اُٹھ، میں آج تجھے کچھ نہ کہوں گا آج کاغذ پر سوال نکال لینا۔ کل سلیٹ خرید لانا۔ اور ہاں، اب لوہے کی سلیٹ خریدنا جیسے اصغر کی ہے"۔

——— اصغر کی! عزیز نے سوچا مگر اصغر کا باپ، تو پٹواریوں کا بڑا افسر ہے اور میرا باپ پٹواری اور جنگل کے داروغے کی گائے بکریوں کے لئے چارہ کاٹنے والا! لوہے کی سلیٹ پر تو بڑے پیسے خرچ آئیں گے اور کل رات ہم لوگ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بھینسے کا گوشت نہ خرید سکے! ——— اب کیا ہو گا!

اُس نے بستہ سر پر اُٹھا لیا۔ غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں بستے کے اندر کھڑکھڑاتے ہوئے سلیٹ کے ٹکڑوں کو ٹٹولنے لگیں۔ اور جب وہ لڑکوں کے جمگھٹ میں داخل ہوا جو اُس کی چیخیں سُن کر اسکول کے احاطے سے باہر اکٹھے ہو گئے تھے تو اس کا

چہرہ فخر سے لال ہوگیا۔ ماسٹر جی اُس کی اُنگلیاں تھامے ہوئے تھے!! اور لڑکے بھی اسکی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ماسٹر جی نے اُس سے ہمدردی کی تھی۔

چٹائی پر بیٹھ کر اُس نے بستے سے سلیٹ کے ٹکڑے یوں نکالے جیسے اپنے سینے سے دل کے ٹکڑے نکال رہا ہے۔ ایک بڑا ٹکڑا اپنے پاس رکھ لیا اور باقی دور ایک جھاڑی میں پھینک آیا۔ ماسٹر جی سوال لکھانے لگے تو پہلے تو اُس نے اپنی سلیٹ کی طرف دیکھا جس کے بے شمار کنارے چاقو کی دھار کی طرح تیز تھے۔ پھر پیچھے مڑ کر قطار کے آخری سرے پر اصغر کی سلیٹ کی طرف دیکھا۔ نئی سلیٹ جس کے ساتھ ایک مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اُس نے نفرت سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر اپنی سلیٹ پر زور سے تھوکا اور ہتھیلی سے مل کر سوال حل کرنے لگا۔

چھٹی کے بعد وہ گھر واپس آرہا تھا۔ کہ رستے میں اُسے اپنا باپ مل گیا۔ جو پٹواری کی گائے کے لئے چارہ کاٹ کر لا رہا تھا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور پھر ہر رونگٹے کی جڑ سے پسینہ پھوٹ نکلا —— سلیٹ کے ٹکڑے کے تیز کنارے اُس کے دماغ کو چیرنے لگے!

باپ نے پوچھا "بیٹا چھٹی ہو گئی؟"

"ہاں ابا" —— "ابا" کہتے وقت اُس کا حلق گھٹ گیا۔ لیکن کھانسی کا بہانہ کر لیا۔ اور پھر اس غیر متوقع کامیابی پر جی ہی جی میں خوش ہونے لگا۔

"گھر جا کر سلیٹ پر خوب سوال نکالنا۔"

"سلیٹ تو ٹوٹ گئی ہے" —— اُس نے یہ جواب دینا چاہا۔ لیکن اُس کی نظر باپ کے بھاری اور کھردرے ہاتھ پر پڑ گئی۔ جو اُس کے گال پر پڑتا تھا تو اسے دن

کے وقت بھی نیلے پیلے تارے نظر آنے لگتے تھے۔ اِس لئے وہ خاموش رہا۔

اُس کے باپ نے پیچھے مڑتے ہوئے کہا: "سُنا؟"

"ہاں"

اس کا باپ پٹواری کے گھر کی طرف چلا گیا اور وہ اپنے گھر آیا۔ ماں کو دیکھ کر اُس کا جی بھر آیا۔ آنسو اُمڈ آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کیوں میرے بچے، تیرے دشمن روئیں تو کبھی نہ روئے۔ تو کبھی نہ روئے میرے بچے، کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ماں بڑی محبت سے اُس کے سر اور گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ماں، میری سلیٹ ٹوٹ گئی"

اس کی ماں دھم سے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ جیسے اُس کا نالائق بیٹا عمر بھر کی کمائی دریا میں بہا آیا ہے۔

عزیز نے روتے ہوئے اپنی باچھوں کو پوری قوت سے ٹھوڑی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "ماں ابا کو نہ بتانا"

ماں نے اپنے کنگن کو مضطربانہ اپنی کلائی میں گھماتے ہوئے پوچھا: "تو پھر کیا سر پر نکالے گا سوال۔؟"

اور عزیز سوچنے لگا کہ اگر سر پر سوال نکالے جا سکتے تو وہ روتا ہی کیوں! اُس کی ماں کتنی بھولی ہے! آخر اَن پڑھ ہے نا! پڑھی لکھی ہوتی تو اُسے معلوم ہوتا کہ سوال سر پر نہیں صرف سلیٹ پر نکالے جا سکتے ہیں!

اُس دن نہ اُس نے ماں سے گُڑ مانگا نہ جوار کے ہلکے پھلکے مرنڈے! نہ کبڈی

کھیلا۔ نہ آنکھ مچولی! اُس کے ہمجولی اُس کے پاس اکٹھے ہو گئے اور مجبور کرنے لگے کہ باہر چلو۔ لیکن ایک سیانا لڑکا پیچھے سے مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور بولا "ارے یار چھوڑ دو۔ اس کی سلیٹ ٹوٹ گئی ہے!" ——— عزیز کے دل پر جیسے کسی نے من بھر ہتھوڑا جما دیا۔ کانپ کر اُٹھا کہ کہیں باپ تو نہیں آگیا۔ لیکن بیل چارے کے انتظار میں کان کھڑے کئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ماں چولھے کے پاس بیٹھی ٹین کے پترے سے ساگ کتر رہی تھی۔

بس وہ چارپائی پر پڑا رہا اور چھوٹے خرگوش کی کہانی پڑھتا رہا۔ اُسے خرگوش پر کئی بار غصہ آیا۔ یہ کتنا غافل تھا خرگوش! ٹھیک اسی طرح جیسے ——— جیسے ——— جیسے ——— اُسے کوئی مثال نہ مل سکی۔ اچانک اُس کی اُداس آنکھیں چمک اُٹھیں ——— "جیسے میں!" ——— اور پھر اُسے اپنے آپ پر اتنا غصہ آیا کہ جی میں آئی کہ ابھی اپنے آپ کو قبر میں دفن کر دے اور اپنی موت پر ایک آنسو تک نہ بہائے اور پھر خوشی خوشی اسکول ——— اُس کا دماغ گھومنے لگا۔ جتنا خیالات کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا۔ اُس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور جب اندھیرا بڑھنے لگا اور اُسکی ماں پکاری "بیٹے ادھر آ۔ روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" تو بے اختیار اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے "ماں میری سلیٹ جو ٹوٹ گئی!"

"کب؟" مگر یہ ماں کی آواز نہ تھی۔

اُس نے سامنے دیکھا۔ اُس کا باپ بڑی بڑی آنکھیں نکالے اُس کی طرف بڑھا آرہا تھا "کب توڑی ہے؟"

اُس نے اپنے آپ کو قبر میں دفن کرنے کی تجویز پر پھر غور کرنا چاہا۔ مگر باپ کے

کے تھپڑ نے اُس کے سلسلۂ خیالات کو بُری طرح منتشر کر دیا اور وہ اتنا رویا۔ —— اتنا رویا کہ آخر اُسے رونے میں لطف آنے لگا۔ وہ اپنا رونا بند نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح ماں کی تسلیوں اور منتوں کے رُک جانے کا اندیشہ تھا۔

"چپ کرتا ہے یا لگاؤں ایک اور؟ —— اور اُس کی آوازیں رُک گئیں جیسے ریڈیو سے کسی "میم" کا گانا سنتے سنتے تنگ آکر ہندوستانی لوگ بٹن گھما دیتے ہیں!

"سلیٹ بھی توڑ آیا اور ریں ریں بھی کئے جاتا ہے —— اندھا —— اندھے تو سامنے دیکھ کر کیوں نہیں چلتا؟ —— ہیں —— یہ ہمیشہ تیری نظر آسمانوں پر کیوں رہتی ہے؟ جیسے اللہ میاں سے باتیں ہو رہی ہیں! —— اندھا —— تُو تو مجذوب ہے!"

مجذوب! —— کتنی بُری گالی دی ہے ابا نے۔ ابا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے اٹھارہ بار مجذوب کہہ ڈالتا۔

اور جب اُس کا باپ اُٹھ کر چوپال کو چلا گیا تو اُس نے ماں سے نہایت رازدارانہ لہجے میں پوچھا: "ماں مجذوب کسے کہتے ہیں؟"

"جسے اللہ میاں کے سوا کسی کا خیال نہ ہو —— یعنی اللہ میاں کا دوست!"

اور عزیز سوچنے لگا کیا اللہ میاں کا دوست ہونا بہت بری بات ہے؟

وہ صبح اٹھا تو باپ اُس کے سرہانے کھڑا تھا۔ "اُٹھتا بھی ہے اب کہ جماؤں ایک؟ —— بے فکرا! —— لے یہ چونی۔ تیری خاطر دس آدمیوں کی داڑھیوں کو ہاتھ لگانا پڑا۔ ابھی قصبے سے جا کر سلیٹ خرید لا۔ اسکول کے وقت آ جائیو! سمجھے؟"

عزیز نے چارپائی سے اُٹھ کر زمین پر قدم دھرا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے

اُس کا دل اُس کی پسلیوں تلے ناچ رہا ہے اور اُس کی آواز کے ساتھ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ آنکھیں آپ ہی آپ جھپکی جا رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ رگ رگ پھڑک رہی ہے، وہ باپ سے چوّنی چھین کر دوڑا ہی تھا۔ کہ اُسے ایک آواز سنائی دی "اے مجذوب! جوتا تو پہنتا جا۔ تیرا تو سر پھر گیا ہے!" اُس نے مڑنے سے پہلے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کا خیال تھا۔ اُس کا چہرہ پیٹھ کی طرف ہو گیا ہے ——— باپ کے تھپڑ کی وجہ سے! آخر سر پھرنے کا اور کیا مطلب ہے؟ اور جب اُسے تسلی ہو گئی کہ وہ اپنی پرانی حالت پر قائم ہے تو اُسے تعجب ہونے لگا کہ "باپ اتنے جھوٹ کیوں بولتا ہے؟

وہ جوتا پہن کر بھاگا۔ قصبہ وہاں سے ایک میل دور تھا۔ چوّنی اُس کی قمیص تلے پہنی ہوئی پرانی سیاہ صوف کی واسکٹ کی جیب میں تھی۔ جسے اُس نے مضبوطی سے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔ ایک دوبارہ اُس نے چوّنی کے گول گول کونوں کو ٹٹولا۔ چوّنی اس کی جیب میں موجود تھی اور نئی سلیٹ قصبے کی ایک دکان میں اُس کی منتظر! ایک جگہ وہ قدرے سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ اچانک سامنے جھاڑی سے اصغر نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنی نئی سلیٹ تھی جس کے ساتھ مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اصغر نے اپنی سلیٹ کو فخریہ انداز سے ہوا میں گھمایا اور عزیز نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ میں بھی نئی سلیٹ ہے جو ٹین کی طرح بجتی ہے اور جس کے ساتھ ماسٹر جی کی ناک جتنا موٹا اسفنج لٹک رہا ہے (ماسٹر جی کی ناک عزیز کی مٹھی سے بڑی تھی!) اصغر کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ لپٹ کر پھر جھاڑی میں گم ہو گیا! ——— کتنا پیارا خیال تھا! سُندر سپنا! وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ قصبے کے تنگ و

تاریک بازار کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ وہ سلیٹوں والی دکان کو خوب پہچانتا تھا۔

دکاندار ایک موٹا سا سیٹھ تھا جس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی توند اپنے گھٹنوں پر پھیلا رکھی تھی۔ وہ صرف ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا۔

عزیز ہانپتے ہانپتے اُس کے پاس گیا۔

"سلیٹیں ہیں؟" یہ سوال اُس نے اس انداز سے پوچھا۔ گویا وہ ساری دکان خریدنے آیا ہے۔

دکاندار نے اپنی ناک پر سے بھنبھناتی مکھیاں اڑاتے ہوئے جواب دیا "ہاں"

"دکھاؤ"

دکاندار نے اپنے بازو زمین پر ٹیک کر اُٹھنے کی کوشش کی۔ اور بہت دیر تک اسی حالت میں ہانپتا رہا۔ عزیز پکارا۔

"لالہ جی"

"ہاں بھائی ہاں" دکاندار اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور عزیز کے سامنے دس پندرہ سلیٹیں رکھ دیں۔

"لوہے کی ہیں؟"

"سب لوہے کی ہیں"

"دام"

"تین آنے!"

——ایک آنہ بچ گیا۔ عزیز کے گال تمتمانے لگے۔ اُس کی ننھی سی ناک پر، اُس کے کھلے سفید ماتھے پر، اُس کے بھرے بھرے سے نچلے ہونٹ کے تلے

پسینہ پھوٹ آیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی یہاں سے دکان سمیت ہوا میں اُڑ جائیگا۔

"اسفنج ہیں؟"

"ہاں"

"سب سے بڑے اسفنج کے دام؟"

"چار پیسے"

عزیز خوشی سے ناچنا چاہتا تھا۔ ایک بار تو اُس کے جی میں آئی کہ دکاندار سے لپٹ کر گائے ؎

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا

لیکن اُس کی توند دیکھ کر اُس کی نظر اپنے پیٹ پر جا پڑی جو ریڑھ کی ہڈی سے چمٹ کر رہ گیا تھا ایک لمحے کے لئے وہ مسکرانا تک بھول گیا اور آخر بولا۔

"تو لایہ سلیٹ اور ایک بڑا اسفنج!"

دونوں چیزیں اپنے قریب کھسکا کر اُس نے قمیص اٹھائی اور واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس کی دو انگلیاں جیب سے باہر نکل گئیں۔ چوّنی راستے میں گر گئی تھی!

بچپنہ

اُس وقت میری عمر یہی کوئی پانچ چھ برس کی ہوگی شہتوت کے درختوں پر لمبے لمبے رس بھرے شہتوت لٹک رہے تھے۔ جیسے وہ صرف میرے ہی حلق سے اُترنے کیلئے بے تاب ہیں۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ لنگوٹا کھینچ تنے سے جو چمٹا ہوں اور اپنے ہمجولیوں کی "شاباش، شاباش" کے نعروں کے سہارے جو اوپر چڑھنے لگا ہوں تو میں یہ سوچنا ہی بھول گیا کہ شہتوت کے درخت ایک جگہ جا کر ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ منہ اُٹھا کر اوپر جو دیکھا تو صرف ایک نازک سی کونپل اپنے چوڑے پتے تھرتھراتی نظر آئی اور اس سے پرے صاف نیلا آسمان، —— اور نیچے۔۔۔۔۔

نیچے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گنجان پتوں سے میری نگاہیں نہ چھن سکیں۔ لمبے لمبے رس بھرے شہتوت مجھے زہریلے کیڑوں کی طرح ٹہنیوں سے لٹکے

دکھائی دینے لگے ــــ اب اترے کون! ــــ ہاتھ پیر پھول گئے۔ حلق خشک ہو کر کڑوا سا محسوس ہونے لگا۔ جیسے بے جانے بوجھے کونین کی گولی چبالی ہو۔ رُؤیں رُؤیں سے پسینہ پھوٹ نکلا اور خوف و دہشت کی دھند میں مجھے تعجب ہونے لگا کہ میں یہاں تک چڑھا کیسے؟ جس ٹہنی سے میں چمٹا ہوا تھا۔ وہ دوسری ٹہنیوں سے یوں الگ تھلگ کھڑی تھی۔ جیسے امیر لڑکیوں کے مجمع میں ایک مفلس چھوکری ــــ پھیپھڑوں کی پوری قوت اور گلے کے پورے پھیلاؤ سے کام لے کر میں پکارا "بھائی عبداللہ!"

اور نیچے میرے خلیرے بھائی عبداللہ نے آواز دی "کب کے ہم لوگ چادریں پھیلائے کھڑے ہیں۔ کوئی ٹہنی وہنی جھٹکاؤ۔ اوپر بیٹھے اکیلے ہی شہتوت نگلے جا رہے ہو!" کلیجے پر جیسے کسی نے مرچیں چھڑک دی ہوں! میں چیخ اٹھا "ارے میں اُتروں کیسے؟"

اور عبداللہ بولا "جیسے چڑھا ہے، ویسے ہی اُتر آ ــــ لیکن اترنے سے پہلے تُو نے ٹہنیاں نہ جھٹکائیں تو ہم مار مار کر نائی بنا دیں گے تجھے ــــ بلّی کی طرح اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اب گلہری کی طرح نیچے اُتر آ!"

اور میں رونے لگا "قسم خدا کی، میں گر جاؤں گا۔ میں یہاں بہت اونچا چڑھ آیا ہوں۔"

دور جا کر عبداللہ اور دوسرے ساتھیوں نے جو دیکھا تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے اور پھر ہدایات کا طوفان شروع ہو گیا "ارے لٹک کر نیچے والی ٹہنی پر انگوٹھے ٹکا دے ــــ اور جب تک انگوٹھے اچھی طرح نہ ٹک جائیں۔ اوپر سے ہاتھ نہ چھوڑیو! اور دیکھو نیچے والی ٹہنی پر بہت زور نہ دیجو، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔

—— بہت کمزور دکھتی ہے!"

آنکھ کے ایک پلکارے میں میں نے ہزار بار ارادہ کیا کہ نیچے لٹک جاؤں لیکن نیچے والی ٹہنی مجھے اتنی دور دکھائی دیتی کہ خوف سے میری ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلووں میں سے آگ سی نکلنے لگتی۔ آخر اللہ کا نام لیکر میں جونہی لٹکا ہوں اور انگوٹھوں کو نیچے والی ٹہنی پر جمایا ہے کہ تڑاخ کی آواز آئی۔ اور میں موٹی موٹی ٹہنیوں سے ٹکراتا، پتوں کے پردوں کو پھاڑتا دھب سے نیچے آرہا، کہتے ہیں۔ میں بہت دیر تک بے ہوش رہا۔

پورے دو مہینے ہسپتال میں رہا اور جب وہاں سے نکلا تو ڈاکٹروں نے صرف اتنا کہا کہ ویسے تو ننھا بالکل اچھا ہے۔ صرف دماغ پر ضرب آئی ہے۔ اس کا اثر زندگی بھر زائل نہ ہوگا۔ اس کی پوری نگرانی کی جائے۔

میری نگرانی یوں ہونے لگی کہ مجھے گھر سے باہر قدم دھرنے کی اجازت نہ تھی۔ گلی ڈنڈا کھیلو تو گھر کی چار دیواری میں! چھپن چھوت کا شوق ہو تو اپنے مکانوں ہی میں چھپتے پھرو! کبڈی کی دھن سمائے تو اپنے دالان میں ہی خاک اڑاؤ —— چند روز تو طبیعت میں بے چینی سی رہی۔ چاندنی راتوں میں جب لڑکے باہر کھیتوں میں کبڈی کھیلتے اور ان کی مسرت بھری چیخوں کی گونج میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی تو میں بیتاب ہو کر پلنگ پر بیٹھ جاتا —— "امی مجھے جانے دو" —— اور امی مجھے ہولے سے تھپکا کر کہتیں،

"نہیں نہیں میرے ننھے۔ آج کل سانپ اور بچھو اور کنکھجورے اور —— اور جن بھوت گلیوں میں رینگتے پھرتے ہیں —— اتنے اتنے لمبے سانپ اور یہ بچھو! اور میری انگلیوں جتنے لمبے کنکھجورے اور —— اور اس بیری جتنے اونچے اونچے بھوت —— کھا جاتے ہیں کبڈی کھیلنے والوں کو!"

اور میں دہشت زدہ ہو کر کہتا "لیکن باہر دوسرے لڑکے ـــــ"

"یہ لڑکے!" امی کے ہاتھ کی تھپک تیز ہو جاتی "یہ لڑکے تو چڑیلوں کے بچے ہیں اور تم اپنی امی کے لال"

طفلی کی منطق کا پیٹ بہت مشکل سے بھرتا ہے۔ میں کہتا ہوں "لیکن عبداللہ بھی تو اُن میں شامل ہے۔ پھر خالہ اماں بھی چڑیل ـــــ"

میرے منہ پر ماں کا ہاتھ جھپٹ جاتا "وہ ـــــ وہ ـــــ وہ عبداللہ! اس بچلے کی یہ آوارہ مزاجی کبھی رنگ لائے گی"۔

لیکن آخر گھر کی چار دیواری میں ساری کائنات سمٹ آئی۔ صحن میں گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا اور جب گلی چار دیواری سے اچھل کر پرے جا گرتی تو کھیل ختم ہو جاتا۔ امی کا حکم تھا کہ "ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر ایک چڑیل بیٹھی رہتی ہے جس کے لمبے لمبے دانت ہیں۔ اُلٹے پاؤں ہیں اور ماتھے پر صرف ایک پاؤ بھر کی آنکھ ہے۔ اگر تو باہر گیا تو دبوچ لے گی تجھے!" میں کہتا "مگر ابھی ابھی تم بھی تو باہر گئی تھیں۔ پھر چڑیل نے تمہیں کیوں نہ چھیڑا؟" ـــــ وہ جواب دیتیں "اسے صرف تجھ سے ضد ہے۔ خبردار باہر جانے کا نام تک نہ لینا"

میرے دل میں خلش سی رہتی کہ یہ چڑیل صرف میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ میں اکیلا چپکے سے ڈیوڑھی سے باہر جھانک بھی آیا۔ لیکن چڑیل مجھے نظر نہ آئی اور پھر امی نے بتایا کہ چڑیلیں نظر نہیں آیا کرتیں!

ایک بار میں ایک کمرے میں بیٹھا تیسری جماعت کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں مجھے امی اور ابا کی باتیں سنائی دیں۔ امی کہہ رہی تھیں "اب ننھے پر یہ

قید کب تک رہے گی؟ خیر سے خاصہ سیانا ہو گیا ہے۔ تم نے ڈاکٹروں کی بات یوں پلّے باندھلی ہے۔ جیسے اس ڈیوڑھی سے باہر اُس کے لئے خدا نہ کرے، کوئی کھائی کھدی ہوئی ہے!"

اور ابّا نے کہا: "باہر نکل کر اگر وہ کوئی اُلٹی سیدھی بات کر بیٹھا تو الزام مجھی پر آئے گا۔ ڈاکٹر میرا ہی منہ نوچیں گے۔ تم بھی مجھی پر انگلی دھروگی۔ اس کا دماغ نت نئی باتیں سوچتا ہے۔ ابھی کل ہی دیوار میں دو گز اونچی کیل ٹھونک کر اور اس پر جوتا رکھ کر اُسے گرانے کی کوشش کر رہا تھا!"

اور امّی بولیں: "لیکن شاید تم بھول گئے ہو کہ اپنے وقت میں تم نے ایک خاصے اونچے مکان کی منڈیر پر سے پاؤں مار کر جوتا گرا لیا تھا۔ لوگ کہتے رہے کہ گردن توڑ بیٹھے گا اور تم ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے لپکے۔ دیوار پر دو ڈگ بھرے اور جوتا ہوا میں اچھل گیا۔ میں ایک کوٹھے سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ یاد ہے نا؟"

"لیکن میں شہتوت کے درخت سے نہیں گرا تھا۔" ابّا ہنس کر بولے۔

اور امّی تنگ آ کر کہنے لگیں: "تو پڑا رہنے دو بے چارے کو۔ تم بوڑھے ہو گئے تو کمائے گا کون؟ آسمانوں سے ہمارے لئے من و سلویٰ اُترنے سے تو رہا عقل کے ناخن لو۔"

اور دوسرے تیسرے روز مجھے اسکول بھیج دیا گیا۔ میری ذہانت کی دھاک بندھ گئی۔ پہلی جماعت کا طالب علم ہوتے ہوئے میں تیسری اور چوتھی جماعت کی کتابیں فر فر پڑھنے لگا۔ چوتھی میں اور پھر آٹھویں میں وظیفہ حاصل کیا اور دسویں جماعت کا امتحان نزدیک تھا تو ابّا چل بسے۔

آنکھوں سے آنسو خشک ہوئے تو چاروں طرف کہر سا اُتر آیا۔ مستقبل کا ہیولیٰ غولِ بیابانی کی طرح میرے خیالات کے ارد گرد منڈلانے لگا۔ گھر میں گوشت کے بجائے دال بکنے لگی! دودھ کے بجائے چھاچھ ملنے لگی! گائے بک گئی تو چھاچھ کی جگہ تالاب کے گدلے پانی نے لے لی۔ اسکول میں فیس کی معافی کی درخواست دی۔ اور نامنظور ہوئی۔ نام کٹا کر گھر آ گیا۔ عزیزوں سے قرضہ مانگا کہ دوکان کھول لوں مگر ہر طرف سے ٹکا سا جواب ملا۔ مزدوری کرنے سے جی ڈرتا تھا کہ خاندانی عزّت کا پاس تھا۔
—— تھک ہار کر بیٹھ رہا۔!

سردیوں کے دن تھے، امّی انگیٹھی میں بجھتے ہوئے اُپلے رکھ کر اندر لے آئیں اور کہنے لگیں "لو، اترو کھاٹ سے اور ہاتھ پیر تاپ لو۔ بلا کا جاڑہ پڑ رہا ہے!"

مَیں نے کھاٹ سے اُترتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا "لیکن امّی۔ یہ اُپلے تو ابھی راکھ بن جائیں گے۔"

امّی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں "تو کہاں سے لاؤں میں پتھر کے کوئلے کہ رات بھر جلتے رہیں۔ تیرا ابّا رقم جمع کرنا تو جانتا ہی نہ تھا تو الگ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھا ہے۔ اُدھر شہروں کی طرف نکل جا۔ کہتے ہیں، وہاں پڑھے ہوؤں کی ضرورت رہتی ہے اور اللہ رکھے۔ تو تو نو جماعتیں پاس کر چکا ہے۔"

امّی مجھ سے تھک چکی تھیں۔ اُن کی مامتا میں مجھے شک نہیں۔ لیکن بیروزگار خدا کو بھی نہیں بھاتا۔ اور امّی تو آخر انسان تھیں۔ مَیں نے اُس رات شہروں میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اور جب امّی کو اِس ارادے سے آگاہ کیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اور بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد رونے لگیں! مَیں نے

تسلیاں دیں تو بولیں "لیکن بیٹا، مجھے یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا مجھے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ ——" ان کی آواز بھرّا گئی!

"جہنم میں جائیں دنیا بھر کے ڈاکٹر" میں نے تنگ آ کر کہا "ایک بار شہتوت کے درخت سے گرا اور ابھی تک اس چوٹ کا تذکرہ چلا آتا ہے۔ میں بھلا چنگا ہوں تم میری ماں ہو، مجھے پالنے پوسنے والی، مجھے پروان چڑھانے والی! —— میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ امی، تم تو بھولی ہو!"

اور امی نے میری گردن چوم لی۔

دوسرے دن میں پانچ روپے لے کر گاڑی پر سوار ہوا اور راولپنڈی جا نکلا —— یہاں پولیس کے انسپکٹر صاحب کے ہاں ایک کام مل گیا۔ ان کا ایک بچہ دوسری اور ایک تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں ان کا ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی اور روٹی کپڑا مفت۔ آسان کام تھا۔ چند دنوں میں دل لگ گیا۔ ایک مہینے کے بعد امی کے پاس دس روپے بھیج دیئے۔ دل پر سے غم و اندوہ کا غبار دھل گیا۔ زندگی پیاری اور دنیا حسین معلوم ہونے لگی۔!

میرا کمرہ بڑے پھاٹک کے متصل تھا۔ ایک رات میں ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ کوئی ۱۲ بجے کا عمل ہو گا کہ پھاٹک پر دستک ہوئی! زنجیر کھولی تو دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی اور دوسری نوجوان۔ برقعے اوڑھے اور چہرے کھلے! ہاتھوں میں ننھے ننھے چرمی تھیلے! ادھیڑ عمر خاتون بولی "تم کب سے آئے ہو یہاں"۔

میں نے کہا "جی بس ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے، یہاں بچوں کو پڑھاتا ہوں"۔

اور وہ دونوں اندر چلی گئیں۔!

مَیں صبح سویرے اُٹھا۔ ننھّے میرے کمرے میں آئے تو مَیں نے پوچھا "یہ نئے مہمان کون آئے ہیں تمہارے ہاں!"

جواب ملا "ایک ہماری خالہ ہیں اور دوسری ہماری خلیری بہن ثریّا۔"

"کب تک ٹھہریں گی یہاں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"خدا جانے۔" جواب ملا۔

جب مَیں بچوں کو پڑھا چُکا اور یونہیں چہل قدمی کے لئے صاف کپڑے پہن کر باہر نکلا تو پھاٹک پر ثریّا کھڑی تھی!

مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں اور ایک طرف ہو گئی۔

اور راولپنڈی کی صاف ستھری اونچی نیچی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہؤا جیسے فضا میں کسی نے عنبر اور لوبان اور قوسِ قزح گھول دی ہے اور جیسے میرے دل کے دریچے اچانک جھپٹ سے کھل گئے ہیں اور اُن میں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اور رنگوں کے مرغولے اندر اڑے آ رہے ہیں۔ یونہی بے وجہ مسکراتا اور گنگناتا رہا اور جب مسکرانے اور گنگنانے تھک گیا تو ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے حسین ترین حصّوں کے چکّر لگائے۔ جب لوٹا تو ایک بج چکا تھا۔ گھر کی ملازمہ زینت پھاٹک پر کھڑی میری راہ تک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پکاری "آپ نے تو بہت دیر لگا دی منشی جی!"

اور جب میں اپنے کمرے میں داخل ہؤا تو بولی "لے آؤں کھانا؟"

"لے آ" میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

کھانا لے آئی تو بولی "پانی لے آؤں؟"

"لے آ" میں نے کہا۔

پانی لے آئی تو بولی "جاؤں؟"

"جا" میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

اور جب وہ جانے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ اُس نے دروازے پر جاکر مجھے پلٹ کر دیکھا ہے۔

اُس کا یہی معمول تھا لیکن آج اُس کی ہر حرکت میں مجھے کئی اسرار پنہاں نظر آ رہے تھے، آج تو جیسے میرے چھوٹے سے دماغ کو کسی نے تیز دھونکنی سے دہکا دیا تھا۔ مجھے دیوار پر ٹنگے ہوئے کلنڈر کی تصویر میں بھی نئے رنگ جھلکتے نظر آتے۔ اور باورچی خانہ میں کام کرتی ہوئی زینت کے کڑوں کی آواز میں کئی دلربا نغمے سُنائی دینے لگے ہیں ان رنگوں اور نغموں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا تھا۔ کہ آواز آئی۔" اور پانی لا دوں؟"

"لا دے" میں نے کہا اور جب میں نے گلاس اٹھا کر زینت کے ہاتھ میں تھمانا چاہا تو میرا انگوٹھا اُس کی اُنگلیوں سے مس ہو گیا۔ اور وہ گلاس کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر ہاتھ جھٹکاتے ہوئے بولی "ہے ہے منشی جی! آپ کا ہاتھ کتنا گرم ہے۔"

اور جب وہ پانی لے کر آئی تو ساتھ ہی کونین کی دو گولیاں بھی تھیں۔" کونین بھی لے لیجیے، کہیں بخار نہ ہو جائے آپ کو۔ آج آپ کا چہرہ بھی لال ہے۔"

"بہت اچھا" میں نے کہا "شکریہ"

اُس نے مسکرا کر برتن اٹھالیے اور جب دروازے تک پہنچی تو مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے لبوں پر بہت پیاری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور میں میز کا روغن کھرچنے لگا۔

دروازے سے نکلی تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر ایک طرف سے پلٹ کر چل دی ادھر سے ثریّا میرے دروازے کے قریب سے گزرتی پھاٹک تک گئی اور پھر دروازے تک آ کر بولی "کیا وقت ہے منشی جی؟"

"جی میرے پاس گھڑی نہیں۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

وہ دیر تک پھاٹک پر کھڑی رہی اور جب اندر جانے کے لئے میرے دروازے کے سامنے سے گذری تو میری طرف دیکھا اور اپنے پاؤں کی ہر چاپ پر میرا دل دھڑکاتی گئی۔ دیوار پر کلنڈر والی تصویر جیسے تلی ہوئی ہتھیلیوں کو گھما گھما کر ناچنے لگی میں نے جاسوسی ناول کو اٹھا کر الماری میں پٹخ دیا اور دیر تک بے معنی باتیں سوچتا رہا اور جب بہت سوچ چکا تو میرا دماغ بے سروپا خیالات کے ہجوم سے پٹا پڑا تھا میں نے سونے کی کوشش کی مگر تکیہ دھڑکنے لگا۔ آرام کرسی پر جا کر بیٹھا تو جیسے زمین نیچے سے ہٹ گئی ہے۔ دیر تک کمرے کے چکر کاٹتا رہا اور جب تھک گیا تو بچے پڑھنے آ گئے۔

رات پڑتے ہی میرے دل کے نہاں خانوں میں سے خیالوں کے پتنگے اُبل پڑے اور دو روشن چہروں کے ارد گرد منڈلانے لگے میں نے اپنے احساسات کے کارواں کو دوراہے پر کھڑا محسوس کیا۔ ادھر ثریّا تھی اور اُدھر زینت! ادھر مکمل یگانگی تھی اور اُدھر دھندلکوں میں لپٹی ہوئی دلچسپی! لیکن اُدھر حسن کے ارد گرد زریں ہالا تھا اور اُدھر گرد و غبار، قدم ڈگمگائے، لڑکھڑایا اور میرے جذبات کے پتنگے میرے ارادے کے تیز جھونکوں میں اڑے اور ثریّا کے چہرے کے زریں ہالے کا طواف کرنے لگے۔ زینت کے تصور کی دھندلی شمع ٹمٹما کر بجھ گئی۔ میں خواب اور بیداری کے درمیان دھندلی خلا میں رات بھر پرواز کرتا رہا اور جب صبح آنکھ کھلی تو سامنے زینت

کھڑی تھی۔

"چائے لے آؤں؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

"لے آ" مَیں نے کہا۔

اور دروازے تک جا کر وہ پلٹی اور کہنے لگی "بخار اُتر گیا ہے؟" ——— اور پھر میرے قریب آکر بولی "دیکھوں تو"

اور اُس نے میری کلائی تھام کر نبض کی تلاش شروع کی۔

"آج تو شاید تمہیں بھی بخار ہے" میں نے کہا "تمہاری انگلیاں تپ رہی ہیں"

اور وہ میری کلائی کو دبا کر بولی "جی ہونا چاہئے تھا مجھے۔ میں رات بھر جاگتی رہی اور دعا کرتی رہی"

مَیں نے اوپر دیکھا تو اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں اور گال تمتا رہے تھے!

جب میں چائے پی چکا تو کچھ دیر کے بعد بچے پڑھنے آگئے۔

مَیں بچوں کو اردو پڑھا رہا تھا کہ اُدھر سے ثریا گذری۔ بچوں کو دیکھ کر اندر چلی آئی اور دری پر بیٹھ کر بولی "بچے کیسے ہیں منشی جی"

"اچھے ہیں" میں نے ثریا کی مرمریں گردن پر بکھرے ہوئے نیم زرّیں نیم سیاہ بال دیکھتے ہوئے کہا "خالد کو اپنی کتاب کی بیشتر نظمیں یاد ہیں۔ اور ریاض جمع تفریق کے سب سوال نہایت آسانی سے حل کر لیتا ہے"

اور وہ خالد کی پیٹھ ٹھونک کر بولی "شاباش خالد تم شاعر بنو گے اور ریاض صاحب کلرک بنیں گے ضلع کچہری میں۔ ریاض تم کیا بنو گے؟"

ننھا ریاض آنکھیں جھپکا کر بولا "ڈپٹی کمشنر"

"اور تم خالد؟"

"شاعر۔"

"کوئی شعر یاد ہے؟" اُس نے پوچھا

"ہاں۔" وہ بولا۔

"سناؤ تو ایک" ثریا مسکرائی

اور خالد بولا ؎

"ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

"شاباش" ثریا بولی: "بڑے پتے کا شعر یاد کر رکھا ہے۔"

اور ثریا میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اپنا ننھا بھائی یہاں بھیج دیں۔ خالو میاں آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

جب وہ چلی گئی اور بچے بھی کچھ دیر کے بعد کھیلنے کے لئے باہر نکل گئے۔ تو میں پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کتابیں الماری میں سجانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ثریا آئی اور بولی۔

"کوئی اچھی سی ادبی کتاب ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے پرانے رسائل کی ایک فائل کو جھاڑ کر کہا: "یہ ادبی رسالے ہیں۔"

"آپ کو ان میں کون سا افسانہ یا نظم پسند ہے؟" اُس نے جھک کر پوچھا۔

اور میں نے ایک افسانہ نکال کر کہا: "یہ" ——— اُوپر دیکھا تو وہ افسانے کی بجائے مجھے دیکھ رہی تھی۔

آنکھیں جھپک گئیں ہم دونوں کی۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا

... "کونسی بات اچھی ہے اس میں ؟"

"مرد عورت کی غیر فانی وفا۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اور اُس نے مسکرا کر فائل اُٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور میں دن بھر مسرور رہا کہ میں ایک ایسی بات کہنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو بڑے بڑے حوصلہ مند نوجوانوں سے برسوں کی کوشش کے بعد بھی ادا نہیں ہو سکتی!

شام کو جب بچے پڑھ چکے تو وہ پھر میرے پاس آئی۔ اور بولی "بہت اچھی کہانی تھی۔ میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا ہے، لیکن ——— اور وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

اور وہ میرے قریب آ کر بولی: "لیکن افسانہ نگار نے مرد کو بہت زیادہ وفاشعار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل مرد کی محبت عورت کی محبت کے پاسنگ بھی نہیں ہوتی!" ——— اور یہی وقت تھا جب تذبذب کے قلعے کا آہنی دروازہ چھپٹ سے کھل کر زمین پر بچھ گیا اور اس کے بعد راتوں کی سنسناتی ہوئی تنہائیوں میں میں نے اُس کمرے میں ثمرہ یا کی زلفوں کے خم گنے۔ اُس کے ماتھے کے نور اور اُس کے ہونٹوں کے رس اور اُس کی باہوں کے گداز کی باتیں کیں۔ کائنات میرے لئے بہت وسیع ہو گئی اور میرے دل و دماغ میں بھوک اور غم کی ٹرانڈ کیسیز ناپید ہو گئی۔ تنخواہ پندرہ کے بجائے ملبیں ہو گئی جو نت نئے لباسوں پر خرچ ہو جاتی تھی۔ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے میں آدھ آدھ گھنٹہ صرف کر دیتا۔ گلے میں ٹائی باندھنے کے جدید طریقے میں نے ہر شناسا سے دریافت کئے! میں نے ایک گھڑی بھی خرید لی!

ثریا بلا کی ذہین اور طباع دوشیزہ تھی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اچھے اچھے مصنفوں کی کتابیں گرد معلوم ہونے لگتیں۔ جب وہ مسکراتی تو روشندانوں کے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے ستارے ماند پڑ جاتے۔ جب وہ میرے قریب ہوتی تو ساری کائنات دم سادھ لیتی!

لیکن جب صبح ہوتی اور زینت مسکراتی ہوئی میرے سامنے چائے کا طشت رکھ کر کہتی "آپ خاموش کیوں ہیں؟" تو چار طرف غیر مرئی اجسام ناچ ناچ کر تالیاں بجانے لگتے اور میرے رویئں رویئں میں دل دھڑکنے لگتا۔ ایک روز جب میں چائے پی رہا تھا اور وہ خاموش میرے پاس کھڑی تھی تو میں نے یونہی اوپر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی!

میں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم یہاں آکر ہر وقت مسکراتی رہتی ہو، یہ ٹھیک نہیں ہیں! ایسا کم ظرف نہیں کہ گھر کی ملازمہ سے عشق کی پینگیں بڑھاؤں مجھے بہت سی مصروفیتیں ہیں، سُنا؟"

اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور اپنے گلے کو ایک ہاتھ سے دبا کر بولی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ——!"

اور وہ کمبخت رو دی!

میں نے کہا "تم میرے کمرے میں نہ آیا کرو سمجھیں؟ کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈو۔ مجھ پر ان آنسوؤں کا اثر نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا آوارہ نہیں۔"

وہ چلی گئی اور شام پڑتے ہی میں اپنے پلنگ پر چادر کی شکنیں درست کر رہا تھا۔ تو اُس نے ہولے سے دروازہ کھولا۔ اور کچھ بولنے کے لئے لب ہلائے

کہ میں نے کہا: "نکل جاؤ میرے کمرے سے نکل جاؤ! ورنہ میں بی بی جی کو بتا دوں گا۔"

"منشی جی!" اُس نے ہراساں لہجے میں کہا: "منشی جی! میں آپ کے لئے ——— میں نے ———"

اور میں بات کاٹ کر بولا: "منشی جی کی بچی! دور ہو جا میرے سامنے سے، گھر کی نوکرانی سے مجھے عشق لڑانا نہیں آتا۔ میں ایسا ذلیل نہیں۔"

اور دروازے سے نکلتے ہوئے اُس نے مجھے یوں دیکھا۔ جیسے میرا گلا کاٹنے کیلئے کسی تیز چھرے کی تلاش میں جا رہی ہے۔!

رات کے دس بجے تھے کہ حسبِ معمول ثریّا چپکے سے میرے کمرے میں آئی چٹخنی چڑھا کر پردے کھینچ دیئے اور میرے پلنگ پر گر پڑی۔!

ہر روز کی دہرائی ہوئی باتیں ہوتی رہیں اور جب وہ تھک گئی تو میں نے کہا: "ثریا میں نہیں جانتا کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا لیکن یاد رکھو کہ میری زندگی کا ہر ہر لمحہ تمہارے نام معنون ہو چکا ہے۔ قانون اور رواج کے بھوت ہمارے دلوں پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس مقدس حرم میں اِن ناپاک روحوں کا گذر نہیں میں تمہارے قدموں پر ———"

چھنا چھن! میرے کمرے کے دروازے کا شیشہ ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا۔ ایک ہاتھ نے پردہ چیر کر ایک طرف کر دیا۔ زینت کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہم دونوں کو گھورنے لگیں اور پھر آواز آئی: "ہوں۔ یہ بات ہے!"

اور وہ لوٹ کر بھاگی اور پکاری: "بی بی جی ——— بے بی جی!"

ثریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میرا دماغ ایک خشمناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ میں بھڑک کر اُٹھا۔ ثریا سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر میرے بکس پر جا گری اور جب اُٹھی

تو کونے میں مکڑی کے جالے اُس کے بالوں سے لپٹ گئے۔

چٹخنی کھول کر مَیں باہر بھاگا۔ پھاٹک کا دروازہ کھول رہا تھا کہ زنان خانے سے زینت کی آواز آئی:۔ "دونوں بی بی جی! دونوں۔ اکٹھے ایک پلنگ پر! منشی جی اور ثریا بی"

مَیں پھاٹک کھول کر باہر لپکا اور آن کی آن میں راولپنڈی کی اونچی نیچی سڑکوں پر اڑتا اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

اور جب گاڑی چلنے لگی تو اچانک مجھے امّی یاد آ گئیں۔ اور امی کی یاد نے میری گذشتہ زندگی کے سارے ورق تیزی سے الٹنے شروع کر دیئے۔!

اور جب میں گھر پہنچا تو نو بجے رات کا وقت تھا۔ امّی انگیٹھی میں جھلتے ہوئے اُپلے ڈالے ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھیں۔ میری گردن کو چوما۔ اور فرطِ محبّت سے بولیں:۔ "تو کتنی رقم لے آیا میرے لال؟"

اور مَیں پھوٹ پھوٹ کر روتا فرش پر لیٹ گیا۔ اور میری جیب میں سے ساڑھے تین آنے نکل کر انگیٹھی کے نیچے لڑھک گئے! ٭

ماں

گو انہوں نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ تاہم پہلی ہی ملاقات میں انہیں معلوم ہو گیا کہ اُن کے مذاق اور مزاج یکساں ہیں۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں ہر حال میں ہم آہنگ ہیں۔ خارجی طور پر اُن کے وجود الگ الگ سہی لیکن ان کا خمیر ایک ہی مادہ سے اُٹھایا گیا ہے!

شادی کے بعد ولی محمد نے اپنی زمین بیچکر ایک خچر خرید لیا۔ اُس کی زمین کے تمام قطعے ڈھلانوں پر تھے۔ جہاں پانی ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتا۔ اور پھر دو سال سے علاقہ پر خشک سالی کا دیو منڈلا رہا تھا۔ خچر خرید لیا۔ اور چوپال پر جاکر اعلان کر دیا کہ اگر کسی شخص کو یہاں سے اسٹیشن جانا ہو تو وہ اُس سے صرف بارہ آنے لیگا۔ اسباب بھی لادے اور خود بھی سوار ہو لے۔ ایک شخص جسے شاید اونٹوں کی تکلیف دہ

سواری کا خاص طور پر تجربہ حاصل تھا۔ بولا "ولی محمد کا یہ کام سارے گاؤں کیلئے سُکھ کا باعث ہے۔ کہاں اونٹوں کے تنگ کجاوے، قدم قدم پر ہچکولے، اُنکے بیٹھنے اُٹھنے کے بھونڈے طریقے، اور پھر کرایہ دو روپیہ، اور کہاں خچر کی پیٹھ، سو جاؤ تو اسٹیشن تک آنکھ نہ کھلے اور پھر کرایہ بارہ آنے!"

ولی محمد کو اپنا مستقبل بہت شاندار دکھائی دینے لگا!

ایک سال میں اُس نے چالیس پچاس رُپے جمع کر لئے۔ ننھا پیدا ہوا تو پانچ رُپے کا گُڑ تقسیم کیا۔ ننھے کی ماں کے لئے جاپانی ریشم کی ایک سُرخ رنگ کی قمیص تیار کرائی جس پر جگہ جگہ نیلے نیلے گل بوٹے تھے۔ گلابو قمیص پہن کر بولی "ہائیں! کیا میں نے قمیض پہن رکھی ہے! مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میں ابھی ننگی کھڑی ہوں۔"

ولی محمد فخریہ انداز میں اکڑ کر بولا "ملائم کپڑا ہے نا! اور پھر عورتوں کے لئے تو ایسے ہی کپڑے چاہئیں۔ تمہیں وہ کھدر کا چولا پہنے دیکھ کر میرا کلیجہ جل جاتا تھا —— اب مزے اڑاؤ!"

لیکن گلابو نے عمر بھر میں ریشم کی صرف وہی قمیص پہنی!

ایک روز چوپال پر ولی محمد نے سُنا کہ اسٹیشن سے لیکر اُن کے گاؤں تک پکّی سڑک بننے والی ہے۔ اب اُس پر تانگے چلیں گے۔ اونٹ خچر کا زمانہ گیا۔

ولی محمد نے چاہا کہ الاؤ سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ اٹھا کر نگل جائے۔

وہی شخص جس نے ولی محمد کے خچر خریدنے پر پُرزور الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا تھا بولا "اونٹ کے ہچکولوں سے نجات ملی تھی۔ مگر سچ کہتا ہوں خچر پہ سوار ہوتے وقت بہت شرم محسوس ہوتی تھی۔ آخر گدھے اور خچر میں فرق ہی کیا ہے! وہی چال ڈھال وہی تراش خراش

میرا تو خیال ہے کہ اگر تمہیں کسی سے دشمنی ہو تو اُسے خچر پر سوار کرا دو!"

اس دن ولی محمد گھر آیا تو خچر کو چارہ ڈالنا بھول گیا۔ خچر کچھ دیر تک خاموش کھڑا ولی محمد کو گھورتا رہا۔ جو کھاٹ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اپنی دُم اُٹھا کر اور تھوتھنی نکال کر ایسی کرخت آواز بلند کی کہ ولی محمد نے اُٹھ کر پھاوڑے سے اس کی کمر توڑ ڈالی گلابو جاگ رہی تھی بولی "ہائے ہائے۔ ایک سال تک تم اس کی آواز ہنس ہنس کر سنتے رہے۔ آج اِس سے کیا قصور ہوُا کہ بیچارے کی پیٹھ پر پھاوڑے برسا رہے ہو؟ اپنے رزق کو یوں پلٹتے ہیں کیا۔؟"

ولی محمد بولا "اری چپ رہ تجھے نہیں معلوم۔ اب یہ کمبخت ہمارے کسی کام کا نہیں اسٹیشن سے یہاں تک سڑک بننے والی ہے۔ اب یہاں لاریاں، تانگے چلیں گے۔ اب خچر وچر کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہمارے بُرے دن آ گئے!"

وہ اپنی بیوی کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا "گلابو، تبا اب کیسے گزر ہو گی۔ زمینیں بِک گئیں۔ ورنہ پھر ہل اُٹھا لیتے۔ مَیں تو سمجھا تھا۔ اب مرتے دم تک ہاتھ کبھی تنگ نہ ہو گا!"

گلابو خاموش رہی۔ ننھا بچہ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوُا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ولی محمد پھر بولا "گلابو، شکر ہے۔ تم میرے پاس ہو، ورنہ میں تو آج روتے روتے دیوانہ ہو جاتا۔"

گلابو نے اپنا ہاتھ ولی محمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ ننھا غوں غوں کرتا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ ٭

سڑک تیار ہو گئی۔ ٹانگے والوں کی بن آئی۔ ولی محمد کے خچر کا تھان پر کھڑے ہو کر اپنی میلی دُم سے مکھیاں اڑانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ولی محمدؐ کی کمائی آہستہ آہستہ برف کے تودے کی طرح پگھلنے لگی۔

اُس کی رفیقۂ حیات اگر گلابو کے علاوہ کوئی اور ہوتی تو وہ اب تک ضرور خودکشی کر چکا ہوتا لیکن باجرے کی موٹی اور بھاری روٹی توے پر ڈالتے ہوئے گلابو اُپلوں کے دھوئیں سے سوجی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر ولی محمد کی طرف دیکھتی تو ولی محمد کو اپنی پیوند لگی قمیض اور سوکھے بے رونق گالوں کا خیال تک نہ رہتا۔ گلابو کی جاپانی ریشم والی قمیض بھی کئی مقامات سے گل گئی تھی اور کئی جگہ سے اُس کا جسم بھی جھلکنے لگا تھا۔ جسے وہ اپنے بازو سے ہر وقت چھپانے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن اُس کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا۔ بس وہ ایک نظر ولی محمد کو دیکھ لیتی تو اُسے یُوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اطلس اور کمخواب سے اپنی جوتیاں پونچھ رہی ہے!

ایک دن ولی محمد صحن کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اچانک اُسے کوئی خیال آیا حقے کی نال ہونٹوں سے الگ ہو گئی۔ اُٹھ کر گلابو کے پاس آیا۔ کہنے لگا "گلابو تیری جوتی تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔"

گلابو مسکرا دی۔

وہ بولا "گلیوں میں چلتے وقت تجھے پتھر چبھتے ہونگے تو ضرور دل میں کہتی ہو گی۔ کہ مجھے کس کنگلے سے پالا پڑا کہ پاؤں میں پہننے کے لیے جوتی تک نہیں خرید سکتا۔"

گلابو کو جیسے کسی ناگ نے ڈس لیا۔ بولی "میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں اور مجھے اپنے آرام سے زیادہ اپنے ماں باپ کی عزت کا پاس ہے۔ میں تمہاری

لونڈی ہوں، کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ تمہارے جوتے کو جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ مجبوری ہے تو پھر گلہ کیسا؟ خدا جس حال میں رکھے۔ اس کا شکر ہے۔ اس سے بدتر نہ کرے۔"

ولی محمد دیوار کا سہارا لے کر بولا۔" مگر گلابو اب تباؤ میں کیا کروں۔ خچر بیچ ڈالوں مگر کون خریدے گا اسے؟ ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے۔ دس بارہ روپے ہی ملینگے چالیس روپے کے خچر کے دس بارہ روپے!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ ننھا گلابو کی گود میں غوں غوں کر رہا تھا خچر اپنے تھان پر آنکھیں کھولے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی تھوتھنی اور آنکھوں پر مکھیوں کی فوجیں بھنبھنا رہی تھیں۔

ناگاہ ولی محمد بولا۔" گلابو! ایک بات سوجھی ہے مجھے۔ اگر تم پسند کرو تو آج ہی سے کام شروع کر دوں۔ اسٹیشن پر ہر وقت مزدوروں کی ضرورت رہتی ہے ہمارا پڑوسی تاج محمد بھی تو اسٹیشن پر کام کرتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس کی بیوی کے پاؤں میں نئے سلیپر دیکھے تھے۔ آخر کچھ تو بچاتا ہوگا۔ تم سے الگ رہنا میرے لئے قیامت ہے لیکن پیٹ کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ کہو تو کل اسٹیشن چلا جاؤں۔!"

گلابو نے رضامندی ظاہر کی لیکن بہت دھیمی اور قدرے بھرآئی ہوئی آواز میں "شاید اس طرح گذری گھڑیاں پھر لوٹ آئیں، تم اسٹیشن پر چلے جانا میں یہیں رہونگی جب کبھی وقت بے وقت کسی مسافر کو خچر کی ضرورت پڑ گئی۔ میں اُسے اسٹیشن تک پہنچا آؤں گی۔ اور تم سے بھی مل لوں گی۔ اندھیرے اُجالے اس راہ پر کئی بار سفر کیا ہے بھولوں گی نہیں۔"

ولی محمد نے اُسی دن ایک چھوٹا سا بستر کاندھے پر رکھا۔ اور آنسو بہاتا روتی

ہوئی گلابو سے رخصت ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

گلابو نے اس کے بعد دو وقت کھانا نہ کھایا۔ اس کا دودھ کم ہوا تو بچہ بلکنے لگا۔ مجبوراً دوسرے روز کچھ لقمے زہر مار کئے اور تمام دن کھاٹ پر پڑی رہی۔ ایک دوبار پڑوس کی عورتوں میں جا بیٹھی لیکن جی نہ لگا۔ واپس آکر اسی کھاٹ پر پڑ رہی جس پر ولی محمد سویا کرتا تھا۔ ننھے سے تادیر باتیں کرتی رہی "ننھے تیرا باپ اسٹیشن پر کیا کر رہا ہو گا۔ جب وہ اپنی پیٹھ پر بھاری بھاری بوریاں اٹھائے گا تو تو اسے بہت یاد آئیگا جب وہ آیا تو تیرے لئے قسم قسم کے کھلونے قسم قسم کی مٹھائیاں لے کر آئے گا۔ ارے منہ کیوں لسور رہا ہے؟ کیا تجھے مٹھائیاں پسند نہیں؟ دودھ پئے گا؟ لے۔"

اس طرح وہ ساری رات بچے سے باتیں کرتی رہتی۔ اور جب وہ سوجاتا تو گھٹنوں میں سر چھپا کر دیر تک روتی رہتی!

ایک رات وہ بچے کو سلا کر دیا بجھانے کے لئے اٹھی۔ کہ باہر کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز آئی "کیا ولی محمد خچر والے کا مکان یہی ہے؟"

"جی یہی ہے؟"

"کیا اس وقت اسٹیشن پر خچر لے جا سکو گے؟"

"جی وہ خود تو گھر میں نہیں۔"

"افوہ! مجھے تو اسٹیشن پر آج رات کو ضرور پہنچنا تھا۔ اور اس وقت تانگہ نہیں ملتا۔"

گلابو نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان بہت قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں بجلی کی ٹارچ لئے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

گلابو بولی "آپ کیا دیں گے اسٹیشن تک ؟"

"مگر خچر کے ساتھ کون جائے گا؟"

"میں!"

"تم ؟"

"جی ہاں"۔

"مگر کیا تم راستہ جانتی ہو؟ اس قدر اندھیرا ہے اور . . . ؟"

"آپ کے پاس چور بتی جو ہے!"

"میں اٹھنی دوں گا۔"

"اٹھنی؟ اسباب ہے؟"

"نہیں۔"

"تو چلئے۔"

گلابو نے جھٹ خچر پر زین رکھا۔ خچر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور وہ مڑ مڑ کر گلابو کی طرف دیکھنے لگا۔ مدت سے اُس کی پیٹھ زین سے آزاد رہی تھی۔ اس لئے ایک دو بار اُس نے ضد بھی کی۔ دو لتیاں بھی جھاڑیں۔ مگر جب دیکھا کہ گلابو زین کس کر ہی دم لیگی۔ تو چپکا ہو رہا۔

گلابو نے ننھے کو سینے سے لگا لیا۔ دروازے کو مقفل کیا۔ نوجوان خچر پر سوار ہو گیا اور دونوں اندھیری گلیوں سے نکل کر باہر کھلے راستہ پر آ گئے۔

اندھیری رات میں ایک اجنبی نوجوان کی ہمراہی میں صرف ایک اٹھنی کے لئے بارہ میل کا پہاڑی سفر کرنا گلابو کی فطرت کے خلاف تھا۔ لیکن وہ سوچتی جا رہی تھی کہ جب

ولی محمد اسے صبح کو دیکھے گا تو خوشی سے یقیناً ناچنے لگے گا۔ ولی محمد کو گاؤں سے گئے صرف آٹھ دن گذرے تھے۔ مگر گلابو سمجھ رہی تھی جیسے آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیاں گذر گئی ہیں!

دو میل بڑی سڑک پر چل کر وہ ایک پگڈنڈی پر ہو لئے۔ یہ راستہ خچروں اور پیدل چلنے والے لوگوں کے لئے تھا جو بڑی سڑک سے تین میل کم تھا۔ گنجان جھاڑیوں، ننھے جھرنوں اور تاریک دروں سے گذر کر وہ ایک گہری کھائی میں پہنچ گئے۔ جہاں سے آگے اسٹیشن تک دو ڈھائی فٹ کی ایک پگڈنڈی تھی۔ جس کے دونوں طرف گہرے بھیانک کھڈ تھے اور کناروں پر گول گول پتھر تھے۔ جو ذرا سے دباؤ سے نیچے لڑھک جاتے تھے۔ یہاں سے گلابو نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب نوجوان کی چھڑی بڑا کام دے رہی تھی۔

وہ کچھ دور گئے تھے کہ نوجوان بولا "تمہارا نام کیا ہے؟"

گلابو کو پسینہ آگیا۔ وہ خاموش رہی۔ ڈرنے لگی کہ کہیں بچہ اس کے دل کی دھک دھک سے جاگ نہ اٹھے۔

"تمہارا نام پوچھا تھا میں نے؟"

"گلابو" گلابو نے یہ لفظ بہت کوشش سے ادا کیا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"گلابو تم نے بڑی مہربانی کی۔ ایسی اندھیری رات میں تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ تم نے بڑی مہربانی کی۔"

گلابو نے سوچا "کیا شکریہ ادا کرنے کا یہی موقع تھا؟ اور یہ نام پوچھنے سے کیا مطلب؟"

نوجوان پھر بولا "لو اب تم خچر پر سوار ہو لو۔ میں پیدل چلوں گا ——— تمہارے لئے"

گلابو نے چاہا نیچے کھڈ میں چھلانگ لگا دے۔ لیکن چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے نے نیند میں کہا۔ "مم۔ مم"۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

فضا بالکل خاموش تھی۔ صرف کبھی کبھی کوئی پتھر خچر کے سم سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں لڑھک جاتا تھا۔ نوجوان کی چوربتی گلابو کے سر پر پڑ رہی تھی اور گلابو کا لمبا سایہ سامنے تنگ پگڈنڈی پر بہت دور تک بچھا ہوا تھا۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار ایک غیر شخص کی زبانی یہ الفاظ سنے تھے۔ اُس کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔

ہمت کر کے بولی: "ذرا سنبھل کر بیٹھئے۔ راستہ بڑا پُرپیچ اور خطرناک ہے۔ جان کا ڈر ہے یہاں۔"

نوجوان زیرک تھا۔ سنبھل گیا۔ اسٹیشن تک اُس نے کوئی بات نہ کی۔

لیکن گلابو کو اسٹیشن پہنچنے تک، بخار سا ہو گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے خاوند کو کیسے منہ دکھائے گی۔ کیا وہ اس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں اور اڑے ہوئے رنگ سے رات کا واقعہ نہ پڑھ لے گا۔

اسٹیشن پر نوجوان سے اٹھنی لے کر وہ ایک طرف ایک شیشم کے درخت سے خچر باندھ کر بیٹھ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی تو اس کے قریب سے ایک شخص گزرا۔ گلابو نے اُٹھ کر پوچھا: "بھائی کیا تم اسٹیشن پر رہتے ہو؟"

وہ رُک گیا اور بولا۔ "ہاں۔"

"یہاں ایک نیا مزدور آیا ہے ولی محمد، کیا تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"وہ اس وقت کہاں ہو گا؟"

"سامنے مسافر خانے میں۔ اُس تختے پر سو رہا ہے وہ!"

خچر وہیں چھوڑ کر وہ مسافر خانے میں گئی۔ مدھم روشنی میں اُس نے ولی محمد کو پہچان لیا اُس نے اپنے گھٹنے سینے سے چمٹا رکھے تھے اور اُس کے خشک بال اُس کے بے رونق چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پہلے تو جھجکی کہ کہیں آنکھ کھولتے ہی وہ اس کے چہرے سے رات کا دلخراش واقعہ نہ پڑھ لے۔ لیکن آخر زبان کو دانتوں تلے دبا کر لرزتے ڈرتے اُس نے ولی محمد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے ہلایا۔

"کون؟"

"میں گلابو"

وہ آنکھیں ملے بغیر اُٹھ بیٹھا "ارے کیسے آئیں۔ ننّھا تو اچھا ہے نا؟"

"اچھا ہے، یہ سو رہا ہے۔ ایک مسافر لائی ہوں"

"تھک گئی ہوگی تم؟"

"نہیں آہستہ آہستہ چلتی آئی ——— کوئی کام بنا؟"

"ہفتے میں تین آنے کمائے۔ ان کی روٹی کھالی۔ آج بھوکا سو رہا ہوں"۔ دروازے سے لوگ آجا رہے تھے۔ ورنہ گلابو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اُس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

ولی محمد بولا "لیکن امید ہے۔ کچھ دنوں میں کام بن جائے گا۔ ایک بابو نے وعدہ تو کیا ہے"۔

گلابو نے اُسے اٹھنی دینا چاہی۔ لیکن ولی محمد نے انکار کر دیا اور بولا "خچر کے لئے چارہ خرید لینا تیل نمک کی بھی ضرورت ہوگی۔ میری فکر نہ کرو" ——— لیکن گلابو نے

اُسے چونی لینے پر مجبور کر دیا۔ ننھے کو ولی محمد کی گود میں رکھ کر روتی رہی۔ اور پھر خچر پر سوار ہو کر گاؤں لوٹ آئی۔

اُسے مہینے میں دو بار پھر اسٹیشن جانا پڑا۔ ابھی ولی محمد کا مستقل کام نہیں بنا تھا۔ مستقل اسامی کا انتظار کھینچنا بجائے خود ایک بیماری ہے۔ اس پر مستزاد متواتر فاقے! ولی محمد کی صحت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اُسے واپس گاؤں لانے کی گلابو نے بہت کوشش کی لیکن وہ یہی عذر پیش کرتا رہا "کیا وہاں مجھے قاروں کا خزانہ مل جائیگا؟ یہاں ایک وقت پیٹ بھر لیتا ہوں۔ وہاں بھوکوں مر جاؤں گا۔"

ایک دن اچانک ننھا بیمار پڑ گیا اس کا گلا سوج گیا۔ اور سانس رُک رُک کر آنے لگی۔ گلابو اُسے گاؤں کے بوڑھے حکیم کے پاس لے گئی۔ اُس نے کہا "اس بماری کا علاج ایک انگریزی دوا ہے۔ جو یہاں نہیں مل سکتی۔ اس پر دس آنے خرچ آتے ہیں۔ اگر وہ لا سکو تو ننھا اچھا ہو جائیگا۔"

گلابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر میں ایک کوڑی تک نہ تھی۔ جی میں آئی۔ سر دیوار پر پٹک کر پھوڑ دے۔ اور مر جائے۔ یوں بچے کو سسکتے ہوئے مرتے دیکھنا۔ تو بہت بڑا عذاب ہے۔ اب اگر اسٹیشن جاتی ہے کہ ننھے کے ابا سے کچھ پیسے مانگ کر دوا خرید لائے تو ننھا اکیلا رہتا ہے۔ اور اگر ساتھ لے جائے تو حکیم کے کہنے کے مطابق سرد ہوا کی وجہ سے بیماری کے بڑھ جانے کا ڈر ہے۔ ساتھ نہ لے جائے تو جانے پیچھے کیا ہو جائے۔ اس کے دماغ میں شعلے اُٹھنے لگے۔ وہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں بے مطلب بھاگنے لگی۔

آخر ننھے کو ایک پڑوسن کے حوالے کر کے خچر پر سوار ہوئی۔ اور اسٹیشن کی طرف

جلدی۔ آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا نہایت تیزی سے چل رہی تھی۔ برق رفتار جھونکے تلوار کی طرح گلابو کا سینہ چیر رہے تھے۔ بوندیاں پڑنے لگیں۔ بادل اس زور سے گرجا جیسے علاقے کے سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر زمین میں غرق ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد موسلا دھار مینہ، بجلی، کڑک، آندھی — بے رُخے جھونکے، خچر کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ گلابو کے کپڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے۔ بارش اور ہوا کے تھپیڑوں سے وہ جھک جھک جاتی تھی۔ درختوں کی چوٹیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ پہاڑی نالے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دہاڑنے لگے جب خچر کسی نالے میں پھنس جاتا تو گلابو مایوس ہو کر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ پگڈنڈی کے نشانات مٹ گئے۔ گلابو اللہ کے آسرے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔

اسٹیشن پر پہنچکر اُسے معلوم ہوا کہ ولی محمد بعارضہ نمونیہ سخت بیمار ہے۔ اور تاج محمد قلی کی کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اُس کی نظروں میں کائنات قلابازیاں کھانے لگی۔ چار جانب سے ایک مغموم سی مسلسل گونج اُٹھنے لگی۔ ہانپتی ہوئی تاج محمد کی کوٹھڑی میں پہنچی۔ ولی محمد اکیلا کھاٹ پر پڑا چھت پر نظریں گاڑے کراہ رہا تھا۔ گلابو کو دیکھکر بولا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

گلابو دہل گئی۔ نہ اس کی زبان ہلی، نہ اُس کی آنکھوں سے کوئی آنسو پھوٹا۔ منہ کھولے ولی محمد کے خشک ہونٹوں کو دیکھتی رہی۔

ولی محمد نے پوچھا "خچر لائی ہو؟"

"ہاں" — جیسے خود اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی ہے!

"تو مجھے گاؤں لے چلو"

وہ خاموش رہی۔

"لے چلوگی ؟"

"ہاں۔ مگر ننھا سخت بیمار ہے۔"

"کیا ؟"

"ننھا سخت بیمار ہے۔ میں اس کی دوا کے لئے تم سے دس آنے مانگنے آئی تھی۔"

"میرے پاس تو ایک کوڑی تک نہیں۔"

گلابو کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہے۔ اُس کی آنکھیں شدتِ غم سے جیسے باہر اُبل پڑیں گی۔

یکایک باہر سے آواز آئی: "ارے بھئی یہ خچر کس کا ہے؟"

گلابو دوڑ کر باہر گئی: "میرا۔"

مسافر کو گلابو کے گاؤں جانا تھا۔ بارش کی وجہ سے سب ٹانگے مسافروں سے بھر کر جا چکے تھے۔

گلابو نے پوچھا: "کیا ملے گا؟"

"آٹھ آنے۔"

"دس آنے دیں گے آپ؟ میرا ننھا بیمار ہے۔ اس کے لئے دس آنے کی دوا خریدنی ہے۔"

مسافر کوئی نیکدل انسان تھا۔ دس آنے نکال دیئے۔ حکیم نے اُسے دوائی کا آسان نام بتا دیا تھا۔ بازار دوڑی گئی۔ بوتل خریدلی۔ بھاگی بھاگی واپس آئی۔ مسافر کو خچر پر سوار کیا اور لگام پکڑ کر آگے آگے چل دی۔ وہ اس قدر تیز چل رہی تھی

جیسے اُس کے پاؤں میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔
تاج محمد نے مسافر خانے سے مسافر اور گلابو کو دُور جاتے ہوئے دیکھا تو ولی محمد کے پاس دوڑا آیا "ولی محمد، ولی محمد گلابو ملی ہے تمہیں؟"

"ہاں"

"مگر وہ تو ایک مسافر کو خچر پر سوار کئے اُڑی جا رہی ہے۔"

"اچھا!"

ولی محمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تاج محمد سے پانی مانگا۔
تاج محمد نے پانی ڈالتے ہوئے کہا "مگر گلابو نے یہ کیا کیا؟"
ولی محمد نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "تم نہیں سمجھتے۔ تاج محمد، تم نہیں سمجھتے کیونکہ تمہاری بیوی کے کوئی بچہ نہیں!"

کرپا کرم

لالہ گنیش داس کمیٹی کے ایک پرائمری اسکول میں مدرس تھے۔ کنبہ اتنا بڑا نہ تھا کہ پریشان رہتے۔ ایک بیوی تھی اور ایک بیٹی۔ بیٹے کی آرزو میں ترستے رہے، یوگیوں کے پاؤں چومے، ویدوں کے قدموں پر تین تین مہینوں کی تنخواہیں نچھاور کر دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئے۔ اپنی بیٹی مایا سے قدرتی طور پر وہ بے انتہا پریم کرتے تھے۔ اور اُسے اتنے لاڈ پیار سے پالا تھا کہ محلے کے آس پاس کھاتے پیتے سیٹھوں کی لڑکیاں بھی اُس کی آن بان دیکھ کر جھینپ جاتی تھیں۔ قضائے الٰہی سے شہر میں گردن توڑ بخار کی وبا پھیل گئی۔ لالہ گنیش داس ایک دن بیمار رہے اور دوسرے دن سورگ سدھار گئے۔ مایا اور اس کی ماتا رام دئی نے سر پیٹ لیے۔ اس بلا کے ناگہانی کا پہلے سے علم ہوتا تو تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہتے۔ لیکن موت بجلی

کی طرح آئی اور لسبا گھر اجاڑ کر چلدی۔ اب یہ دونوں بدنصیب روحیں بے دست و پا ہو کر رہ گئیں۔ کرایہ کا مکان تھا۔ تیسرے ہی دن وہاں سے کوچ کر کے ایک اور محلے میں آ گئیں۔ ایک اندھیری گلی میں ایک اندھیری کوٹھڑی تھی۔ آٹھ آنے ماہانہ کرایہ تھا وہیں رہنے لگیں۔ دو چار روز بے حد پریشان رہیں۔ آگ جلاتی تھیں تو سارا دھواں کوٹھڑی میں گھومتا رہتا تھا اور گھنٹوں وہ ہوا کے بجائے دھواں پھیپھڑوں میں بھرتی رہتی تھیں۔ اندھیرے کی وجہ سے ہوا میں نمی سی پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دھواں وہیں جم کر رہ جاتا تھا جب بیچاری رام دئی پھونکیں مارتے مارتے ادھ موئی ہو جاتی تو مایا اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے کہتی "ماتا جی! میں آپ سے کئے بار کہہ چکی ہوں اس کام سے میں نپٹ لوں گی۔ لیکن آپ سنی ان سُنی کر دیتی ہیں۔ ادھر چٹائی پر ہو جائیے۔ میں آگ جلاتی ہوں"

رام دئی رو کر کہتی "پتری جب تیری آنکھیں ان گیلے اپلوں کے دھوئیں سے سوج کر سُرخ ہو جائیں گی۔ اور جب تیرے آنسو ڈھلک کر راکھ میں گر پڑینگے تو تیرے پتا جی کی آتما سورگ میں بے چین ہو جائے گی۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتی!"

دس بارہ پھونکیں مار کر وہ پھر کہتی "پتری جب تک میں زندہ ہوں۔ مجھے چولھے کے قریب نہ جانے دوں گی۔ آخر میں بڑھیا اور کس کام کی ہوں! بھگوان کرے تیرے بھلے دن قریب ہوں"

مایا سوچا کرتی کہ اب بھلے دنوں کی دعا سے ماتا کا کیا مطلب ہے! اندھیرے میں کھدر کی چادروں پر بیل بوٹے کاڑھ کر ماتا جی جو آنے دو آنے کماتی ہیں۔ ان سے پیٹ بھر لیا جاتا ہے۔ کوٹھڑی کا کرایہ مشکل سے ادا ہوتا ہے۔ ابھی پتا جی کے کریا کرم

پر جو تم خرچ ہوئی تھی۔ وہ بھی اُن کے دوست رام بھروسہ کو ادا کرنی ہے۔ پھر یہ بھلے دنوں کی آرزو کیسی!

چند ہی دنوں میں وہ سامنے گلی سے گزرنے والوں کی صورت سے شناسا ہو گئیں گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی اور اُن کی کوٹھڑی سے گلی کے اختتام تک پانچ چھ مکان تھے۔ صبح شام چار بابو لوگ اُن کے سامنے سے گزرتے تھے۔ اُن کی عمریں ڈھل چکی تھیں۔ اور وہ اکثر اپنی بڑی بڑی پگڑیوں کے نیچے اپنے سفید بال چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے مسجدوں کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور کلیساؤں کے پرانے کلسوں پر امام اور پادری سبز بیلیں چڑھا دیتے ہیں۔

ان کے بچے کبھی کبھی کھیلتے کوٹھڑی کے قریب آ جاتے۔ اور مایا ایسی من موہنی صورت والی لڑکی کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتے۔ مایا ان سے پیار کرتی۔ انہیں اُن پریوں کی کہانیاں سُناتی جو بہت اونچی اڑیں اور اس جرم کی پاداش میں اندھیرے گہرے اور بھیانک غاروں میں بند کر دی گئیں۔ ننھے بچے پوچھتے ”تو کیا اونچائی ایشور کو پسند نہیں؟“ مایا جواب دیتی ”ایشور اُن لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں جو دھرتی پر چلیں پھریں اور دھرتی پر بیٹھیں اُٹھیں۔ تم چوتھی پانچویں منزل پر رہتے ہو خبردار ہا کر وہ نہیں تو تمہارا انجام بھی اُن پریوں کا سا ہو گا۔“ بچے یہ سُن کر زور زور سے ہنسنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اُن کی ہنسی میں ایک رکاوٹ سی پوشیدہ ہوتی۔ جیسے اُنکی آواز اُن کی مرضی کے خلاف نکل رہی ہے۔ تین چار روز تو یہ بچے آتے رہے۔ پھر اچانک اُنکا آنا جانا بند ہو گیا۔ چوتھے پانچویں روز ایک بچی جھینپتی چھپاتی مایا کے پاس آئی اور بہت مدھم آواز میں بولی ”اب ہم کہانیاں نہیں سُنیں گے۔“

مایا نے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگی "ماتا جی کہتی ہیں کہ ان گندی کوٹھڑیوں میں رہنے والیوں کا سایہ بھی پڑ جائے تو سارا جیون دکھی ہو جاتا ہے، پر بابا تو ہیں ہی نہیں۔ کہتی ہیں یہ سب غریبوں کی من گھڑت باتیں ہیں اور اونچے رہنے والے ایشور کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔"

مایا بولی "اچھا سمترا ں یونہی سہی۔"

لیکن وہ بچی اکثر ہفتہ دس دن کے بعد مایا کے ہاں ہو جاتی تھی۔

گلی سے صبح و شام ایک نوجوان مہترانی بھی گزرتی تھی۔ اس کا صاف سانولا رنگ اور نکھرے نقوش دیکھ کر انسان کو دھوکا ہوتا تھا کہ کہیں کسی امیر گھرانے کی لڑکی نے تو جھاڑو نہیں اٹھالی۔ وہ جھاڑو دیتے ہوئے ہمیشہ ایک گیت گنگنایا کرتی تھی۔

پتیم تم بھی چلتے بنے
اپنی داسی کو ٹھکرا کر
آشا کے دیپک کو بجھا کر
پتیم تم بھی چلتے بنے

مایا کو اس مہترانی سے پریم سا ہو گیا تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے اس کی منتظر رہتی اور جب وہ گلی کے آخری سرے سے "پتیم تم بھی چلتے بنے" کی مدھم لہراتی تان سنتی تو کوٹھڑی کی دہلیز پر آکر بیٹھ جاتی اور اس کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ گلی میں جھاڑو دیتی ہوئی جب مایا کے قریب آتی تو مسکرا کر کہتی "سلام بی بی جی۔"

"سلام" مایا جواب دیتی لیکن اس کا دل پکار پکار کر کہتا "بہن مہترانی، تیرا جیون مجھ سے کہیں اچھا ہے میں تیرے اس محبت بھرے سلام کے لائق نہیں۔"

ایک روز رام دئی محلے میں کسی کو چادر دینے چلی گئی۔ مایا اکیلی بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنیں گن رہی تھی کہ "یتیم تم بھی چلتے بنے" کی رسیلی تان سے اُس کا دل رُک سا گیا۔ جب مہترانی اُس کے قریب آئی تو اُس نے پکار کر کہا: "بہن"

مہترانی کی جھاڑو اُس کے ہاتھ سے گر گئی!

ایک اچھوت لڑکی کو ایک برہمن کی پتری بہن کہہ ڈالے! کیا سورج پچھم سے بھی اُبھرتا ہے!

مہترانی حیرت زدہ ہو کر مایا کو گھورنے لگی۔

اُس نے پوچھا: "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

مایا نے جواب دیا: "ہاں، بہن!"

اُس نے جھاڑو اٹھائی اور مایا کے قریب آگئی: "حکم؟"

"کچھ نہیں ذرا طبیعت اداس تھی تمہارا گیت سنا تو خیال آیا کہ شاید تم بھی میری طرح دکھی ہو۔"

"ہاں، بی بی۔ مَیں بے حد دکھی ہوں لیکن میرے دُکھ کی بپتا سننے کے لئے تمہاری جوانی مناسب نہیں۔ مَیں نے بڑے بڑے دُکھ بھوگے ہیں بی بی جی۔ تم اُن کا حال سُنو تو عمر بھر روتی رہو۔"

مایا کانپ اٹھی۔ اس دُنیا میں ہر آتما دکھی کیوں ہے؟ اس باغ میں ہر پھول کے سینے پر داغ کیوں ہے؟

مہترانی نے پوچھا: "آپ کی ماتا کدھر ہیں؟"

"محلے میں کہیں چادر دینے گئی ہیں۔"

"اچھا بی بی میں جاتی ہوں۔ تمہاری ماتا نے مجھے تم سے باتیں کرتے دیکھ پایا تو جانے کیا ہو جائے گا۔"

مایا کے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے بات نہیں کر سکتا کہ ایک جھاڑو دے کر اپنا پیٹ پالتا ہے، دوسرا چادروں پر بوٹیاں کاڑھ کر! یہ بھی کیا قانون ہے، اس قانون کا بنانے والا کون ہے! اس قانون کے چلانے والے کون ہیں! یہ مہترانی اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر اوقات کرتی ہے میں دن بھر یہاں بیٹھی مکھیاں مارا کرتی ہوں اور پھر بھی یہ مجھ سے جھجکتی ہے!

دکھوں نے مایا کو بہت حساس بنا دیا تھا۔ بولی "لیکن بہن، مجھے تم اپنی بپتا کا کچھ حصہ تو سنا ہی دو ورنہ میں پریشان ہو جاؤں گی۔"

مہترانی نے جھاڑو دیوار سے لگا دی۔ آنکھیں دور دھندلے خاکستری آسمان پر گاڑ دیں۔ اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ ابھرتا ہی چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کے گلے کی رگیں ایک ایک کر کے ابھرنے لگیں۔ بڑی دیر کے بعد بولی "مایا دیبی۔ ٹوٹی سارنگی کیا خاک بجے گی۔ بجھا دیا کیا خاک راہ دکھائے گا۔ میں کیا بتاؤں۔ میں نے پریم کیا ہے، میرا پریمی بہت سندر بہت بانکا چھبیلا جوان تھا۔ جب اندھیری راتوں کو میں شہر سے باہر کوڑا پھینکنے جاتی تھی تو وہ ایک جگہ میرا منتظر بیٹھا ہوتا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہتا تھا "سنتو، لا یہ ٹوکری میں پھینک آؤں۔" پھر وہ مجھ سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا میرے بالوں سے کھیلتا تھا۔ میری آنکھوں کو چومتا تھا۔ ان دنوں میں نے اتنی بھاری ٹوکریاں اٹھائیں کہ آج کوئی نوجوان بھنگن اٹھا وے تو جانوں۔ ایک بار شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی

پُس نے حملہ کیا تو میرا پریمی ایک سپاہی کے ہتھے چڑھ گیا۔ اتنے ڈنڈے کھائے کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پر پیچھے نہ ہٹا۔ ہسپتال اٹھا لائے۔ راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجھے پتہ لگا تو میں نے یوں سمجھا جیسے صاف سیدھی سڑک پر جاتے جاتے میں بہت گہرے کنوئیں میں گر گئی ہوں، اب بی بی! گاتی ہوں اور روتی ہوں، روتی ہوں اور گاتی ہوں سوچتی ہوں، میں نے کیوں پریم کیا۔ پریم کیا تو اُسے انت تک کیوں نہ نبھایا اور اگر انت تک نبھاؤں تو میری بوڑھی ماتا کی کون چھکر کرے۔ وہ بھوکوں مر جائے گی۔"

مایا تھرّا اٹھی سنتو جھاڑو اٹھا کر چل دی۔ وہ دور تک اپنی میلی چادر سے آنکھیں پونچھتی گئی۔

مایا کے دل پر سنتو کی باتوں نے ایک ایسا گہرا نقش چھوڑا تھا۔ کہ وہ دن بھر پریشان رہی اور ساری رات جاگتی رہی۔ اُس کا دل اچھل اچھل کر اُسے کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی، کچھ کرے۔ لیکن کیا کرے؟ یہ بات اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی وہ محسوس کرتی تھی۔ کہ کوئی اس کے اتنا قریب ہو جائے کہ اس کی سانسیں اُس کے چہرے پر کھیلنے لگیں لیکن وہ کون ہو! —— ماتا؟ —— نہیں! تو پھر وہ کون ہو؟ مایا کی زندگی میں ماتا کے سوا کون تھا۔ جو اس کے اتنا قریب ہو۔ اُس کے روئیں روئیں میں درد بسنے لگا۔ جب اُس کی ماتا چادریں دینے کہیں چلی جاتی تو مایا محسوس کرتی کہ کوئی اُس کی اندھیری کوٹھڑی میں آ گیا ہے۔ ہر طرف نور ہی نور ہے۔ جدھر دیکھو وہی ہے جس کونے میں چھپو وہاں موجود ہے۔ وہ اُسے چھیڑتا ہے۔ اُس کے بالوں سے اُس کے گالوں سے، اُس کے ہاتھوں سے کھیلتا ہے۔ اُس کا سینہ تپ رہا ہے۔ اُس کے لب دہک رہے ہیں۔ اُس کا سر گھوم رہا ہے۔ وہ اُسکے

قریب آجاتا ہے، بہت قریب آجاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ جیسے وہ کہیں موجود نہیں۔ جیسے اُس کی ہستی بھاپ بن کر اُڑ گئی ہے اور اس اندھیری کوٹھڑی میں، باہر دھندلی گلیوں میں، اونچے بالاخانوں پر، گرم فضا میں، خاکستری آسمان پر۔ ہر طرف وہی چھایا ہوا ہے ——— پر وہی "کون ہے؟

اُس کی ماتا حیران رہنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ مایا اندر ہی اندر جولا بدل رہی ہے جب وہ چلی جاتی ہے تو کوئی اس اندھیری کوٹھڑی میں آتا ہے اور اُس کی مایا سے اتنا کھیلتا ہے کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ آخر ایک دن رام دتی نے اپنی بیٹی سے یہ بات پوچھ ہی لی۔ "مایا پتری تو چپ چپ کیوں رہتی ہے؟"

مایا بولی "ماتا جی، نہ جانے کیا بات ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ایسی چپ سادھ لوں کہ پھر کبھی نہ بولوں۔ آپ کے دم سے ہر چیز موجود ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں۔ پر جانے یہ سارا سنسار ویران کیوں نظر آتا ہے۔ ماتا جی یہ کوئی بیماری تو نہیں؟"

"رام رام کر بیٹی، رام رام کرو۔ ایشور بیماریوں سے بچائے۔ اصل میں کوٹھڑی تنگ ہے نا۔ بدبودار گلیاں، گندی ہوا۔ میں بھی کچھ سست رہنے لگی ہوں۔"

مایا نادیر سوچتی رہی کہ شاید اُس کی گھبراہٹ کی یہی وجہ ہو! ——— شاید یہ آب و ہوا کا اثر ہو! شاید ———!

کچھ دنوں کے بعد گلی میں سے ایک اور شخص بھی گزرنے لگا۔ یہ ایک نوجوان تھا۔ انگریزی لباس، داڑھی مونچھ صاف، پانچ منزلوں والے مکان کی طرف

چلا جاتا اور جب واپس ہوتا تو بابا کی کوٹھڑی کے سامنے سے یوں گزر جاتا۔ جیسے وہاں کوئی ذی نفس آباد نہیں سیٹی بجاتا زیرلب کچھ گنگناتا بغیر نظر پھیرے بے پروائی سے آگے بڑھ جاتا۔۔۔"

اور بابا سوچا کرتی۔ یہ نوجوان کون ہے۔ اور یہ یہاں سے گزرتے وقت مجھے دیکھتا کیوں نہیں اور میرا دل اس کی طرف کیوں کھچا جا رہا ہے۔ اور میں کیوں چاہتی ہوں کہ یہ میرے پاس آکر مجھ سے باتیں کرے۔ اور میری انگلیاں اس کی انگلیوں کو ڈھونڈنے جھپٹیں اور یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے۔ کیا یہ وہی "تو نہیں ہے اگر یہ وہی ہے تو میری اندھیری کوٹھری کو بقعۂ نور کیوں نہیں بناتا! یہ تو یہاں سے گزرتے وقت ادھر دیکھتا تک نہیں۔ پھر یہ کون ہے۔ اور میرا اس سے کونسا روحانی تعلق ہے کہ یہ میرے سنسان طویل دنوں اور ویران اجڑی راتوں پر چھایا جا رہا ہے۔

جب اس کی ناتا باہر چلی گئی تو وہ دہلیز پر بیٹھ کر اس پانچ منزلوں والے مکان کو دیکھتی رہی اور خود ہی ننھے ننھے گیت بنا کر گاتی رہی ———— ایک روز اس نے ایک گیت گایا ؎

اونچے بسنے والے پیتم آجا میرے پاس
تجھ بن مجھ بے بس دکھیا کی ہر ہر سانس اداس
کون بندھائے آس
پیتم
آجا میرے پاس

مڑ کر دیکھا تو مہترانی کھڑی دھیرے دھیرے جھاڑو ہلا رہی تھی بولی "بی بی سلام

بڑا دکھی گیت گایا۔ کس کا ہے؟

"چنڈی داس کا" ---- اور مایا اپنے آپ کو واقعی چنڈی داس ہی سمجھنے لگی۔ جس نے رادھا کی زبانی برہن کے گیت کہلوا کر تباہ حال استریوں کے ہر دے مول لے لئے! اب مایا کا خاص مشغلہ جذبات بھرے گیت کہنا اور گانا تھا!

راتوں کو جب اُس کی ماتا گنیش داس سرگباشی کی باتیں کرتے کرتے سو جاتی تو مایا چارپائی پر سے اُٹھتی اور باہر دہلیز پر بیٹھ کر اونچے بالاخانے پر نظریں گاڑے رکھتی جب تارے ٹمٹماتے اور اندھیری رات تنگ گلیوں میں سائیں سائیں کرنے لگتی۔ تو مایا اپنے وہ گیت گنگنانے لگتی۔ جو اُس نے بھگوان جانے کس مستی میں آ کر کہے تھے۔ اور جنہیں گا کر وہ یوں محسوس کرتی جیسے اُس کی ساری آشائیں پوری ہو گئیں۔

کئی بار وہ نوجوان گلی سے گزرا۔ پر اُس نے پلٹ کر مایا کی طرف نہ دیکھا۔ مایا ایک بار گلی کے عین وسط میں ٹہلنے کے بہانے سے چلی گئی۔ وہ آیا اور ایک طرف سے ہو کر نکل گیا۔ اُس دن مایا اس قدر روئی کہ آنکھیں گھنٹوں سُرخ رہیں۔!

ایک رات اچانک اس کی ماں کے پیٹ میں درد اُٹھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ گھر میں جو کچھ میسّر آسکا۔ استعمال کیا۔ سونف، پنیر، کالا نمک، اخشک ہر بڑ۔ لیکن رام دئی کو افاقہ نہ ہوا۔ اگلا دن بھی اُسی درد و کرب میں گزرا۔ ایک بار مایا نے دیکھا کہ وہی نوجوان جاتے جاتے رُک گیا ہے۔ اور اُس کی بوڑھی ماں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُسے اپنی گذشتہ ناکامیوں اور ماں کی پریشان کن علالت کے دُکھ بھول گئے!

رات کو رام دئی اسی طرح چیختی رہی۔ دوسرے دن صبح کو اس کی حالت نازک

ہوگئی۔ وہ نوجوان کوٹھڑی کے دروازے تک آیا اور بولا "کیا حال ہے ماتا جی کا؟"
مایا کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کا گلا گھٹ گیا۔ آنسو امڈ آئے۔ زبان لرزی۔ مگر کوئی لفظ نہ ڈھال سکی۔ نوجوان مغموم اور اداس واپس چلا گیا اور مایا اس دوہری ناکامی پر بلک بلک کر روئی۔ اودھر اس کا رونا بند ہوا۔ اِدھر رام وتی کی پتلیاں پھر گئیں۔ مایا پکاری "ماتا جی۔ ماتا جی"
رام وتی کے نحیف لب لرزے اور دھیمی سی آواز آئی "بھگوان دیا۔ دیا بھگوان۔"
ایک مرنے والی اور ایک رہنے والی ——— ساری دنیا میں تنہا۔ سارے سنسار میں اکیلی! مایا کی چیخوں سے متاثر ہو کر ننھی سمتراں اور سنتو مہترانی دوڑی آئیں اور اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں مگر اور کوئی نہ آیا۔
وہ اب ماتا کے خشک پنجر کو کہاں لے جائے۔ اس کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی اور گھر میں اتنا سامان نہ تھا کہ بیچکر چتا کے لئے لکڑیاں خریدی جا سکتیں۔ کریاکرم پر تو بہت خرچ آتا تھا!
چار گھنٹے کے بعد دس بارہ آدمی آئے۔ انہوں نے رام وتی کی لاش اٹھائی مایا روتی چیختی انکے پیچھے ہولی۔ چتا تیار تھی۔ آگ بھڑکی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔
"ماتا"
لکڑیوں کی چٹخ پٹخ کے سوا اور کوئی صدا سنائی نہ دی!
وہ گھر کو لوٹی جیسے کوئی مسافر اپنا سب کچھ کسی رہزن کے حوالے کر کے خستہ و درماندہ کسی طرف منہ اٹھا کر چل دیتا ہے
راستے میں اسے سمتراں ملی۔ اداس چہرہ مری چال۔ مایا نے پوچھا "سمتراں

تجھے کیا ہو گیا؟"

ننھی بولی "آج بھیّا رو رہے تھے۔ کہتے تھے مایا کو بہت دکھ پہنچا۔"

وہ سُندراں کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔ اُسکا دماغ گھومنے لگا۔ جیسے اُس نے بہت تلخ شراب پی لی ہے

دروازے پر پہنچی، اندر جانا چاہتی تھی۔ کہ پیچھے سے اُسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی نوجوان آہستہ آہستہ اُس کی طرف آ رہا تھا۔

وہ اُس کے قریب آ کر رُک گیا اور بولا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دیا کرو۔"

مایا کے دل میں بجلی کی سی کڑک بلند ہوئی۔ اُس نے آنکھیں جھکا کر پوچھا "تو کیا کریا کرم پر آپ نے خرچ کیا۔؟"

وہ خاموش رہا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولا "اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

مایا نے اسی انداز سے جواب دیا "میرے کریا کرم پر بھی آپ ہی خرچ کیجئے گا اور..."

"اور کیا؟" نوجوان نے پوچھا۔

مایا نے سامنے دیکھا۔ نوجوان کی نظریں جھک گئیں!

مایا کی جیسے کسی نے دل کی گرہ کھول دی *

بچے

بچے

والد نے جو اثاثہ چھوڑا تھا۔ وہ ہم میاں بیوی کے لئے کافی تھا۔ مرغن کھانے اور ریشمی کپڑے نہ سہی لیکن بہر حال ہم زندہ رہ سکتے تھے۔ دن بھر لاہور کے بازاروں کے چکر کاٹنا اور رات کو گھر آکر مزے سے سو جانا۔ بس یہ میرا معمول تھا۔ لیکن اچانک میرے عزیزوں نے میرے خلاف ایک سازش سوچی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بیگم بھی اُن کی ہمنوا ہو گئی۔ سب کہنے لگے کہ نوکری پر جاؤ۔ ہزار بار کہا۔ نوکری صرف اِس لئے کی جاتی ہے کہ پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل مہیا ہو جائے اور یہاں ہم اللہ کے فضل سے خالی پیٹ کبھی نہ سوئے لیکن وہ نہ مانے۔ دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ درخواستیں لکھنے کا فن سیکھنا پڑا اور آخر دہلی کی ایک فرم میں تیس روپے ماہانہ کی ایک نوکری مل گئی —

تیسرے درجے کا ٹکٹ انگلیوں میں دبائے میں دہلی اسٹیشن پر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ آج

مَیں چھ ماہ بعد لاہور جا رہا تھا کیونکہ بیگم کا خط آیا تھا کہ جلدی پہنچو۔ جلدی ہی پہنچنے کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نظر نہ آئی کہ "میں اداس ہوں" ——— مَیں بھی اداس تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرد کی اُداسی عورت کی اداسی کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ عورت اداس ہو جائے تو مجھے ساری کائنات اداس نظر آنے لگتی ہے!

نو بجے صبح کا وقت تھا۔ جب گاڑی دہلی کے وسیع اسٹیشن سے گرجتی ہوئی لپکی تو میں نے سارے کمرے پر ایک چھلنی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر اخبار کے اس ٹکڑے کی عبارت پڑھنے لگا جس میں مجھے پکوڑیاں لپیٹ کر دی گئی تھیں:۔

راولپنڈی ۷ جنوری۔ پشاور سے آتی ہوئی ٹرین کے تیسرے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں ایک نوجوان کی لاش پائی گئی جس کی جیب سے ایک خط اس مضمون کا نکلا "بھوک میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بھوکا رہا نہیں جاتا اور بھوک دور کرنے کا جو علاج سُوجھتا ہے۔ رائیگاں جاتا ہے۔ اس لئے افیون کھا کر سو رہا ہوں۔ جہاں لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھے کھڑکی سے باہر پھینک دیں۔ کیونکہ مَیں اُن بھوکی چیلوں اور فاقہ کش گِدھوں کی غذا بننا چاہتا ہوں جنہیں مدت سے کوئی مردہ جسم نہیں ملا۔ میری بیوی کو چاہیے کہ اپنے ننھے کی حفاظت کرے اور میرے بعد اُداس نہ رہے۔ کیونکہ عورت اداس ہو جائے تو مجھے ساری کائنات ———"

یہاں سے آگے کاغذ پھٹ چکا تھا۔ تختوں پر لیٹے ہوئے مسافر مجھے زرد اکڑی ہوئی

لاشوں میں تبدیل ہوتے نظر آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان مُردوں کے جمگھٹ میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کر کے میرا کلیجہ برف کی طرح یخ ہو کر رہ گیا! یہ احساس ایک خوفناک صورت اختیار کرنے لگا۔ جیسے کوئی جی ہی جی میں بھنکار رہا ہے ——— یہ انجن نہیں ملک الموت ہے اور ہم سب مُردہ انسان ہیں، جو اس زمین سے بہت دُور ابدی آگ کی لپٹوں میں جھلس کر انگارہ ہونے کے لئے بے تحاشہ بڑھے چلے جا رہے ہیں ——— سامنے خطرے کی زنجیر نے سر ہلا کر جیسے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اور میں اپنے ہم جنسوں اور سب سے زیادہ خود اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس پر جھپٹا کہ ایک بوڑھے کی کھانسی نے مجھے اس انجنوں، پٹڑیوں اور ریلوں والی دنیا میں لا ڈالا۔ میں نے آنکھیں ملیں، سر کھجایا، انگلیاں چٹخائیں۔ اور اپنے دائیں طرف نظر ڈالی۔ وہی بوڑھا بوری کا ایک ٹکڑا اجلا کر چلم پر رکھ رہا تھا۔ مگر کھانسی کے جھٹکوں سے چمٹے کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی اور اس کی لرزتی ہوئی انگلیاں اسی کے بجھتے ہوئے دھاگوں کی طرف دوبارہ بڑھتیں۔ اُس کے قریب ایک بچہ گنڈیریاں چوس رہا تھا اور اس کی انگلیوں، ہونٹوں اور ناک پر بے شمار مکھیاں پنجے گاڑے بُری طرح چمٹی ہوئی تھیں! ——— پرلی طرف ایک بڑھیا اونگھ رہی تھی۔ اُس کے بے رنگ مسوڑے جو دانتوں کا بوجھ اتار چکے تھے خشک ہونٹوں کے درے نظر آ رہے تھے اور اُسکی زبان سرخ سی گیند بنی اُس کے گلے پاس پڑی سو رہی تھی۔ ایک طرف ایک لالہ جی چادر کے پلّو سے روپے کھول کر گن رہے تھے اور جب کوئی پیسہ اُن کی برق رفتار انگلیوں سے کھسک کر فرش پر گر جاتا۔ تو وہ اس پر باز کی سی تیزی سے جھپٹتے اور

قریب ہی لیٹا ہوا ادھیڑ بند دہقان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا اور پھر اُنہیں گھورتا ہوا گھٹنے سمیٹ کر سو جاتا! ایک اندھا لاٹھی کو زمین پر لٹائے بیت الخلا کے دروازے سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں تازہ گوشت کی طرح سُرخ تھیں! ایک بھنگی نوجوان عورت اپنے ننھے کو ایک چھاتی سے لٹکائے ایک بوقلموں دوپٹے کو سر پر اوڑھنے، کھسکانے اور پھر اوڑھ لینے کے شغل میں مگن تھی! اُس کے بالوں میں ایک جاپانی کلپ چمک رہا تھا اور میلی کلائیوں میں جاپانی چوڑیاں! ——— اوپر تختے پر لوہے کا ایک تھرڈ کلاس بکس پڑا تھا جس کا قفل بار بار بکس سے ٹکرا کر سارے کمرے والوں کو جیسے وقت کی تیز گامی سے خبردار کر رہا تھا یہ سب تیسرے درجے کے لوگ اور سب تیسرے درجے کی چیزیں۔

بائیں جانب ایک لمبے تختے پر پانچ ننھے ننھے بچے بیٹھے تھے۔ اور اُنکے درمیان اُن کی ماں تنگ تختے پر بہت مشکل سے آلتی پالتی مارے جم کر بیٹھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اُس کی ناک بہت چپٹی تھی۔ اور رنگ بہت سیاہ ——— اُس نے کلائیوں میں کنگن پہن رکھے تھے۔ جو اُس کی چوڑیوں سے ٹکرا کر بار بار بجتے تھے۔ ننھے بچے لپک لپک کر اُس کی گود میں آتے۔ وہ انہیں چمکارتی، پچکارتی، کسی کا ماتھا چوم لیتی کسی کی ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتی۔ اِدھر ایک کے ہاتھ میں ریوڑی تھما دی۔ اُدھر دوسرے کی قمیص کا بٹن چڑھا دیا۔ بات بات پر ہنسی اور اُس کے چوڑے دانت بجلی کی روشنی میں چنگاریاں بن جاتے ——— سب سے چھوٹا بچہ اُسی گود میں بیٹھے بیٹھے ہمک کر ایک شخص کے پاس جا کر تا جو ان سب کے مقابل والے تختے پر اونگھ رہا تھا۔ وہ نیم خوابیدہ حالت میں ننھے کے آبنوسی گالوں کو تھپکتے ہوئے کہتا

"لے بھاگ جا امی کی گود میں۔ ورنہ تو بری جگہ لے لے گا اور تو پڑا رو دے گا ـــــــ اور بچہ ہونہار آنکھیں جھپکاتا ہوا، کھسکتا ہوا بدصورت عورت کی گود میں آجاتا۔ گاڑی کا شور ان بچوں کی چیخم دھاڑ کے نیچے دب گیا اور میری ساری توجہ ان بچوں نے کھینچ لی۔

ان سب کی عمروں میں بتدریج ایک ایک سال کا فرق ہوگا ـــــــ سب کی ناکیں چپٹی تھیں اور سب کے رنگ کالے۔ موٹے موٹے ہونٹوں تلے اُن کے چوڑے چوڑے دانت چمک رہے تھے اور فرش پر بکھرے ہوئے پھلوں کے چھلکوں پر سے مکھیاں اڑ اڑ کر اُن کے نتھنوں کے ارد گرد بھنبھنا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے دو دو بچوں کے سر ٹکرا جاتے تھے۔ تیسرے کے ہاتھ سے سفید ربڑ کی پھٹی ہوئی گیند جو انگلی کے ذرا سے مَس سے پچک پچاپ جاتی تھی۔ چھوٹ جاتی، ادھر ایک کا ہاتھ موٹے ہوئے مضبوط اور جسیم دہقان کے آہنی گھٹنے تلے دب جاتا۔ اور دوسرے کو اس کی کھڑکی میں سے لٹک جانے پر زور سے پیچھے کھینچتی اور اُس کی ٹھوڑی سے خون پھوٹ پڑتا تو سب منہ کھول کر اور آنکھوں کو اُلٹے ہاتھوں مل مل کر رونے بسورنے لگتے۔ اس کے بعد ماں باپ کو اُنہیں خوش کرنے کی مہم پیش آجاتی۔ ماں کسی کے گدگدی کر رہی ہے۔ تو باپ کسی کے کانوں میں بھونڈے گیت گا رہا ہے! ماں تالو اور زبان کی مدد سے پٹاخے چھوڑ رہی ہے تو باپ بوڑھے بلّے کی سی میاؤں سے سب کو خوش کر رہا ہے! کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور بھیگی ہوئی پلکوں پر اُس کے شفاف آنسو بھی مسکرانے لگتے۔ کوئی رونا بند کر دیتا اور تعجب سے ماں باپ کو گھورنے لگتا۔ کوئی مسکتا رہ جاتا اور ماں کے داہنے گھٹنے کے تلے دھری ہوئی گٹھڑی کی طرف تب تک جھک جھک کر دیکھتا رہتا۔ جب تک کہ ملیٹھی روٹی

اور گڑ میں لپٹے ہوئے چنے اُس کی جھولی میں نہ ڈال دیئے جاتے۔

باپ نے ایک بار سونا چاہا تو ایک ننھے نے اُس کی ناک کھینچ لی۔ مگر وہ اُٹھا تو ہنستا ہوا! ادھر ماں اونگھنے لگی۔ اور ایک مے اُس کی لمبی لمبی بالیوں اور الجھے ہوئے بالوں سے زور آزمائی کرنا شروع کردی اور وہ ننھی مٹھی سے بالوں کی جٹائیں اور بالی چھڑا کر اُٹھی تو پیار سے اُس کے گال تھپک دیئے۔!

یہ کیسے ماں باپ ہیں اور یہ کیسے بچے ہیں! مَیں نے سوچا! یہ باپ اپنے بچے پر برستا کیوں نہیں اور یہ ماں اپنے ننھے کے منہ پر کنگن سمیت ایسا بھرپور ہاتھ کیوں نہیں جماتی۔ کہ وہ آرام سے بیٹھ رہے۔ ان شرارتوں کی کلوں سے یہ دونوں روحیں تنگ کیوں نہیں آجاتیں! انہیں اپنے بدصورت بچوں سے کیا اُمیدیں ہیں! ان غلیظ بھونڈے چھوکروں میں کونسی خصوصیت ہے۔ جس کے نیچے ان دو روحوں نے اپنی بے آرامی اور تکالیف کو چھپا رکھا ہے! ——— اور پھر اس اخبار کے پرزے والا باپ! ——— خودکشی کر رہا ہے اور بیوی سے بچے کی حفاظت کی استدعا جاری ہے! آخر اس ملک کے بچّوں کو بڑے ہو کر ملک اور قوم کے لئے وہ کونسی مہمیں سر کرنی ہیں کہ ان کے وجود اس قدر عزیز رکھے جائیں۔!

مَیں نے آگے بڑھ کر ان بچّوں کے باپ سے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے"۔

"قصور"

"کیا کام ہے وہاں؟"

"ولیم صاحب کا پنکھاقلی ہوں"۔

"کیا تنخواہ ہے؟"

"نورو پے!"

—— نورو پے اور یہ سات وجود! یہ کیا کھاتے ہوں گے۔ اور جو کچھ کھاتے ہوں گے اُس کے بل پر کیسے جیتے ہوں گے! تلخ حقائق کے نشتروں نے میرے احساسات کو چھلنی کرنا شروع کیا تو بھینگی عورت اپنے بچے کے منہ کو ایک چھاتی سے دوسری چھاتی کی طرف منتقل کرتی ہوئی میرے سامنے انگڑائی بن کر بیٹھ گئی اور —— اور مَیں سوچنے لگا کہ اِس رنگا رنگ دنیا کا ہر پہلو کس قدر مختلف ہے یہ اخبار کا پھٹا ہوا پرزہ —— یہ بیگم کا خط —— یہ سوتے ہوئے، اونگھتے ہوئے۔ تھکے ہوئے مسافر —— یہ بدصورت ماں اور یہ بھدّا باپ! —— یہ سیماب کی طرح تڑپتے ہوتے بے آرام بچے اور یہ جاپانی کلاپ والی بھینگی نوجوان عورت —— یہ کھڑکھڑاتی ریل اور یہ پھنکارتا انجن —— یہ قدم قدم پر منزلیں اور گام گام پر سفر کی ابتدا! —— یہ آرزوئیں اور یہ اُمیدیں —— یہ غلام ہندوستان اور یہ کلکاریاں مارتی ہوئی نئی پود —— یہ سب کیا ہے! یہ کیا ہنگامہ ہے —— یہ نوجوان جس نے اپنی مفلسی کے ہاتھوں خودکشی کی ہے، اگر زندہ رہتا اگر کچھ روز اور فاقے کاٹتا تو ہندوستان میں ایک بیوہ اور ایک یتیم کی تعداد کم ہو جاتی —— اور پھر مر کر بھی ننھے بچّے کی پرورش کی تلقین —— ایک ایسے بچے کی دیکھ بھال جو بڑا ہو کر غلام بنے، اہلِ زر کے تلوے چاٹے، ماں کا نام بگاڑے۔ اور پھر بھی بھوکا رہے اور باپ کی طرح افیون کھا کر گاڑی کے تیسرے درجے میں پڑا رہے۔

—— اور پھر یہ مسافر کدھر جا رہے ہیں اور —— دُور بوڑھا حقہ نوش حقے کی نال اپنے پوپلے منہ میں جما رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا، گنڈیریاں

چوسنے والا لڑکا ایک گٹھڑی سے سر لگائے سو رہا تھا اور مکھیاں اُس کے چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں۔ اور اُس کے نتھنوں، باچھوں اور آنکھوں کے کونے میں گھسی پڑتی تھیں! اُس کی پتلیاں نیند کے بس میں آکر اوپر چڑھ گئی تھیں اور قمقموں کی روشنی میں اُس کی نیم وا آنکھیں پتھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لیٹی ہوئی بڑھیا سینے پر مٹھیاں بھینچے کھانس رہی تھی! لالہ جی پوٹلیوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ اور زمیندار اپنی ایڑیوں کی دراڑ میں سے پھوٹتے ہوئے خون کو اپنی چادر کے ایک کونے سے پونچھ رہا تھا کہ اچانک ڈبے میں ہڑبونگ مچ گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اُٹھے اور اوپر تختوں سے کھوپڑیاں ٹکرا کر پھر نیچے دبک گئے۔ بچے چلّا اُٹھے۔ بوڑھے کا حقہ اُلٹ گیا۔ بدصورت ماں اور باپ اُن وحشیوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ جن کے دیوتا پر کوئی آنچ آگئی ہو!

بیوی کھڑکی سے ناف تک لٹکتی ہوئی پیچھے دیکھ کر چیخ رہی تھی: "میرا ننھا ہائے میرا ننھا۔ میرا لال۔ ہائے میرا اُمنار ہائے! ———" اور باپ بہت دور پھنکارتے ہوئے انجن کی طرف دونوں بازو ہلا ہلا کر پکار رہا تھا "اے ڈرائیور! اے انجن چلانے والے! ——— اے میرا مُنّا گر گیا ہے ——— مجھ غریب کا خزانہ لٹ گیا ——— ذرا کسی بٹن کو کھینچ لے ——— اے ———"

لیکن کھڑکھڑاتے پہیّوں اور گرجتی بھاپ کے شور میں اُس کی چیخیں بیوی کے پریشان بالوں کی طرح پیچھے اُڑ گئیں! میں لپک کر اُس کے قریب آیا اور اُسے اندر کھینچ کر پکارا "اے یہ زنجیر کھینچ، یہ خطرے والی زنجیر ——— ٹنگ جا اس سے ——— زور سے کھینچ ——— اور زور سے ——— گاڑی رک جائے گی

اور تم اپنے ننھے کو اٹھالانا" —— اور جب گاڑی کی رفتار مدھم ہونے لگی تو ایکبار سر دُھنتی ہوئی ماں نے گاڑی کے اندر جھانکا میں نے اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے۔ اس کے بال کچی کھچی جھاڑی کی طرح نظر آرہے تھے اور اُس کا کالا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اُس کے چولے کے کمزور بٹن ٹوٹ گئے اور اسے اپنی عریانی کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے پھر ایک آسیب زدہ کی طرح آنکھیں پھاڑ کر باہر جھانکنا چاہا۔ مگر ماتھا کھڑکی سے ٹکرا گیا اور چوڑیاں تختے سے —— رنگ برنگ چوڑیاں کرچی کرچی ہو کر گنڈیریوں کے آس پاس بکھر گئیں اور اُس کی کلائیوں اور ماتھے سے خون پھوٹ نکلا لیکن آن کی آن میں اُس کا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر لٹک گیا۔ بھدا باپ بار بار اپنے پانو فرش پر سے اُٹھاتا اور رکھ دیتا۔ جیسے تپتے تانبے پر کھڑا ہے رہ رہ کر مجھ سے پوچھتا "بچ جائے گا لڑکا؟" —— اور میں اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتا "جب تم کہتے ہو کہ بچہ ریت پر گرا ہے۔ تو آخر نرم ریت پر اُسے کیا چوٹ آئی ہو گی۔ ذرا سی تو جان ہے۔ بہت وزنی جسم ہوتا تو شاید زخمی ہو جاتا مزے سے لیٹا آسمان پر نظریں گاڑے انگوٹھا چوس رہا ہو گا" ادھر مسافر ایک ایک کھڑکی سے چار چار سر باہر نکالے چہ میگوئیاں کر رہے تھے "ریت پر گرا ہے —— نہیں، سرکنڈوں کا جھنڈ تھا —— اوہ سرکنڈوں کا جھنڈ! —— نہیں ایڑی کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے کنکروں پر پہنچا تھا! —— اوہ کنکروں پر! —— مر گیا ہو گا —— شاید نہ مرا ہو —— بے چارا! —— بس یوں ٹھمک کر گیند کی طرح باہر جا گرا —— چچ چچ چچ چچ"!!

اور اُن دو چار لمحوں میں میں نے سوچا کہ یہ ماں باپ کتنے دیوانے ہیں ——

دیوانے اور بے وقوف! پانچ بچوں میں سے اگر ایک ننھا سا غلیظ چھوکرا کم ہو جائے تو وہ اس قدر چیخ چلا کیوں رہے ہیں۔ کیا یہ چار بھونڈے چھوکرے ان کی امیدوں کے محل میں ستونوں کا کام نہ دے سکیں گے؟ ——— کیا مادرِ ہندوستان کی گود کو ایک اور غلام سے بوجھل کرنے ہی میں سعادت مندی ہے! ——— اس ایک ننھے میں کیا جادو بھرا تھا۔ کہ پاگل ہو رہے ہیں دونوں۔ گاڑی سے باہر لٹکے جا رہے ہیں ——— اور اگر اُدھر سگنل والا کھمبا دماغ سے ٹکرا گیا تو پڑے ایڑیاں رگڑیں گے!

گاڑی ابھی پوری طرح نہیں رکی تھی۔ کہ میاں بیوی نے چھلانگ لگا دی۔ اُن کے چہرے مہین دھول سے اَٹ گئے۔ خاک کا ایک طوفان اڑاتے وہ بھاگے اور آن کی آن میں بہت دُور نکل گئے۔ گارڈ بغل میں جھنڈیاں دبائے ہانپتا ہوا آیا اور پکارا "کون تھا زنجیر کھینچنے والا"؟

ہم سب نے بھنبنوں کی طرح اڑتے ہوئے دونوں میاں بیوی کی طرف اشارہ کیا جن کے ڈھیلے ڈھالے لباس ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور جن کے کالے کلوٹے بچے منہ کھولے، ناکیں سڑسڑاتے چیخ رہے تھے۔ گارڈ نے جھنڈیوں کو ایک بغل سے نکال کر دوسری بغل میں دباتے ہوئے کہا "یہ تھرڈ کلاس والا لوگ بہت تنگ کرتا ہے کیا گرا ہے ان کا؟"

مَیں نے کہا "بچہ!"

اور گارڈ جھنڈیوں کو پرلی بغل سے نکال کر انگلیوں میں گھمانے لگا۔ اس کی بھویں جھک آئیں اور پتلیاں پھیل گئیں۔ بولا "اوہ! بچہ! چچ چچ چچ چچ!"

—— اور جُوسی ہوئی گنڈیریوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جاپانی کلپ والی بھینگی عورت اپنے ننھے کی ناک پونچھ کر بولی ”یہ کانچ کے کھلونے یوں الگ چھوڑ دیئے جائیں تو سمجھو بس ٹوٹ گئے۔ مَیں نے تو اپنے ننھّے کو کبھی کلیجے سے جدا نہیں کیا۔“ —— اور اُس کے ننھّے نے اچانک مُوت دیا اور وہ اُسے تختے پر تقریباً پٹخ کر بڑبڑائی ”موئے تھوڑا دودھ پیا کرو۔ ہر وقت چُپ چُپ لگائے رکھتا ہے!“

اور اُس کے سر پر سے دوپٹہ کھسک گیا ”اوئی!“ وہ میری طرف دیکھ کر ممنائی اور اُس کی ترچھی آنکھ کی ایک پتلی ایک طرف پھسل کر کہیں غائب ہو گئی۔ اُس طرف بڑھیا جس کے مسوڑھے دانتوں کا بوجھ اتار چکے تھے۔ بولی ”اے بیٹی یہ دوپٹہ کا ہے کا ہے؟“

”ریشم کا“ اُس نے اپنے بچے کو کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا ”ولایتی ریشم ہے ننھے کی پیدائش پر بھیّا نے خرید دیا تھا —— جالندھر سے!“

”تبھی تو تیرے سَر پر نہیں ٹھہرتا۔ ولائتی ریشم ہے نا —— اور بیٹی جالندھر میں ریشم بنتا ہے کیا!“

اور وہ مسکرا کر بولی ”نہیں ری بھولی خالہ! جالندھر میں تو لدھیانے کا کپڑا بنتا ہے۔ ولایتی ریشم تو ہانگ کانگ میں بنتا ہے کیونکہ وہاں ریشم کے درخت پالے جاتے ہیں!“

اور یک بیک شور مچ گیا۔ میاں بیوی بچے کو اٹھائے پٹڑی کے دونوں طرف اُگے ہوئے سرکنڈوں میں سے نکلے۔ اُن کے بچے چیخ چیخ کر کھڑکیوں سے لٹکنے

اور دروازوں سے کودنے کے لئے بیتاب ہو گئے جب وہ ہمارے قریب پہنچے تو بچہ اپنے ننھے ننھے سیاہ بازو آسمان کی طرف اُٹھائے ہنس رہا تھا اور بدصورت ماں باپ اس زور سے ہانپ رہے تھے جیسے ہمالہ کو عبور کر کے آ رہے ہیں!

اس کے بعد بہت دیر تک ریلوں، بچوں کے گرنے اور ماؤں کی غفلت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ "یہ ریل نہیں" "یہ تو موت ہے موت" ——— "میرا ننھا اٹک کے پل پر سے بہک کر گر گیا تھا دریا میں" ——— "بس خود لمبی تان کر سو رہتی ہیں اور ننھے من مانی کرتے ہیں" ——— "ممتا ختم ہو گئی!" ——— موضوع بدلنے لگے، نوجوانوں کا خودکشی سے مرنا ——— نوکری کا فقدان ——— انگریزی تعلیم کی تباہی ——— ملک کی افسوسناک حالت ——— غلے کے چڑھے ہوئے نرخ ——— جنگ کی ہولناکیاں ——— گاندھی جناح ——— پیر زرد پوش علیہ الرحمۃ ——— تعویذ گنڈے ——— قوالی ——— بائی گلزار جان ——— لاہور کا ٹبی بازار ——— لاہور کی منڈی ——— گندم کا بھاؤ اور روٹی کی کمی ——— اور نہر میں پانی بہت کم ہے" ——— "بیگار پر نہ پکڑیں تو سچے دل سے خدمت کریں" ——— "دھوبی کی بیٹی دن دہاڑے اغوا ہو گئی" ——— "سرحد پار کا ایک پٹھان سینگ بیچنے آیا اور پھسلا کر لے گیا!" ——— اور اس طرح دُنیا جہان کی تھرڈ کلاس باتوں پر بھونڈے مگر بے باک انداز میں خیال آرائی کے بعد یہ لمبی لمبی لٹھوں اور غلیظ حقوں والے اپنی اپنی منزلوں پر تیسرے درجے کے ڈبوں سے اُترتے چلے گئے!

اور گندی ریلوں کے چھلکوں پر مکھیاں اُسی طرح بھنبھناتی رہیں!

اور جس وقت پانچ بچوں والے میاں بیوی اسٹیشن پر اُترے تو ڈنڈا دیسے

چمٹ چمٹ کر اور پائدانوں پر کانپ کانپ کر ——— ادھر ایک ننھا بغل سے کھسک گیا۔ اُدھر دوسرا بلبلا اُٹھا۔ ادھر ایک گٹھڑی لٹک گئی ——— ادھر "ٹن ٹن" بجتی لٹھ پلیٹ فارم پر گر گئی ——— پیسے کی پکوڑیاں خریدی گئیں ——— پیسے کے لال بیر اور پیسے کی بھُونی ہوئی مونگ پھلی ——— اور یہ پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہندوستان جنت نشان کے آئندہ دور کے پنکھا قلی تھرڈ کلاس کے دروازے سے گذرتے ہوئے مسافروں کے سیلاب میں بہ گئے!

بہت دیر تک میں مبہوت بیٹھا رہا۔ بچوں سے لوگ اس درجہ محبت کیوں کرتے ہیں یہ کیا بات ہے کہ کالے چہروں، موٹی ناکوں اور بھونڈے اعضا والے لڑکوں کو مائیں اسی ازلی محبت سے چومتی ہیں جس طرح ایک پھول ایسے شگفتہ بچے کو ——— اور پھر یہ کیا راز ہے کہ جاپانی کلپ والی بھینگی عورت اپنے جوبن کا اشتہار دینے کے علاوہ بچے کو چھاتی سے بھینچے ہوئے ہے اور یہ بوڑھا جو ایک بار پھر بوری کا ٹاٹ اُجلا کر سارے ڈبے کو دھواں دھار کئے ہوئے ہے اور یہ بڑھیا جس کے پوپلے منہ میں اُس کی زبان بڑ کی گینہ کی طرح لرز رہی ہے ——— یہ سب کدھر جا رہے ہیں۔ آخر اس بڑھیا کو ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا کہ لکڑی کے تختے پر بیٹھی ہر اسٹیشن کو کالا شاہ کاکو سمجھ کر اُترنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اور جب اُسے بتایا جاتا ہے کہ وہ اسٹیشن تو ابھی بہت دُور رہے تو آہ کھینچ کر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے "نوج یہ کیسی ماری گاڑی ہے!"

میں نے ایک بار بڑھیا سے پوچھ لیا "تجھے کیا کام ہے کالا شاہ کاکو میں؟" بولی "اُدھر میری بیٹی رہتی ہے ——— میں سہارن پور کی رہنے والی ہوں۔

پنجاب کا ایک مزدور وہاں کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹی بیاہ دی۔ بیچاری چودہ سال بے اولاد پڑی روتی رہی۔ پرسوں اُس کی چھٹی آئی ہے کہ اُسکے ایک ننھا ہوا ہے۔ اِس لئے ادھر پنجاب میں اِس عمر میں بھٹک رہی ہوں۔ یہ اُس کیلئے کپڑے لئے جا رہی ہوں ولایتی ریشم کے!"

اور مَیں نے بڑھیا کی تسلّی کے لئے اُس کی گٹھڑی ٹٹول کر اُس بوڑھے حقہ نوش سے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے باباجی؟"

"لاہور!" بلغم بوڑھے کے حلق میں کھڑکھڑانے لگی!

"کون رہتا ہے وہاں آپ کا؟"

"بیٹا ــــ اُس کے ہاں پرسوں ایک لڑکا ہوا ہے!"

گنڈیریوں کے چھلکوں پر مکھیاں بھنبھنا کر بیٹھ گئیں!

لاہور اسٹیشن کی گہما گہمی اور باہر سڑکوں کی ہماہمی میں اِن تھرڈ کلاس خیالات سے پیچھا چھڑا کر میں گھر آیا تو دروازے پر مجھے ایک بڑھیا ملی اور مِلتے ہی پکاری "تو آ گیا میرے بچے، مبارک ہو تجھے، تیرے گھر کل شام ایک لال پیدا ہوا ہے!"

"کالے رنگ کا لال" اندر سے ایک شریر لڑکی پکاری۔ میں ٹھٹھک گیا۔ محلے والیاں جمع تھیں۔ بڑھیا نے جب مجھے یہ بتایا کہ ننھا کچھ بیمار ہے تو میں نے وہیں سے احکام صادر کرنا شروع کر دیئے: "بیگم کو روشندانوں والے کمرے میں رکھا جائے اور میں مس ایولٹ لیڈی ڈاکٹر کو بلائے لاتا ہوں ــــ نیز بچے کو گرم کپڑوں میں لپیٹا جائے ــــ بیگم بہت باتیں نہ کریں۔"

اور شام کو جب سب محلے والیاں چلی گئیں تو مَیں نے اپنی سوئی ہوئی بیگم

کے پہلو میں ننھے کو دیکھا، کالا رنگ ــــــ موٹی ناک ــــــ بھونڈے اعضا ــــــ وہ نیند میں اچانک چونک کر رونے لگا اور مَیں سمجھا۔ وہ ہمک کر گاڑی کے نیچے گر گیا ہے!

"کیا ہے؟" بیگم نے نحیف آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

مَیں نے بغل سے ایک پوٹلی نکال کر کھولی اور قیمتی کشمیرے کا دو گز ٹکڑا ننھے کے اردگرد لپیٹتے ہوئے بولا "یوں ــــــ سردی نہ لگ جائے ننھے میاں کو!"

بیگم کے گالوں پر گلابیاں بکھر گئیں۔ باہر سے آواز آئی ــــــ "بیروزگار ہوں غریب ہوں۔ ننھے ننھے بچے ہیں۔ ننگے ہیں۔ بھوکوں مر رہے ہیں۔ کوئی خدا ترس ــــــ!"

میرے سامنے جیسے گنڈیریوں کے چھلکے بکھر گئے۔ اور دماغ میں خطرے کی زنجیر حرکت کرنے لگی ؛

میرا رانجھا

میرا رانجھا

سرکنڈے کے چھپر تلے ایک عورت بیٹھی تھی اور کچھ دور تالاب کے سبز پانی میں ایک دوشیزہ گاگر گھما رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حدِ نظر تک میدان لرز رہا تھا۔ جوہڑ کے کنارے بیری کا ایک ٹنڈ منڈ درخت دھوپ میں اکڑ گیا تھا۔ گاؤں کے جو پندرہ بیس گھر تھے۔ اُن پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چھپر اور تالاب کے وسط میں ایک بیمار کمزور کتیا دُم لٹکائے ایک جھاڑی کی طرف رینگتی جا رہی تھی ــــ!

اچانک عورت کھنکارتے ہوئے زور سے پکاری "بے اماں! اری وہیں جا کر مر گئی تجھے گاگر گھمانے میں بڑا مزا آتا ہے! ایک ڈبکی دے اسے اور لپک کر اِدھر آ۔ میرے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں!"

بیٹھے بیٹھے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں! اماں کی آنکھیں جو آسمان کی طرح نیلی اور

سیپی کی طرح صاف تھیں جھپک گئیں۔ کیا یہاں نہ ہے! پاؤں ٹوٹ رہے ہیں ــــ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ایک اور آواز آئی "اری سُن رہی ہے تو کہ مجھے اُدھر آنا پڑیگا؟ پچھلپائی! تُو تو اب من مانی باتیں کرنے لگی۔ آنے دے اپنے چچا کو حرامزادی کی چوٹی نہ کٹوادی تو"

امامی نے گاگر سر پر دھر لی۔ پانی دو ایک بار چھلکا۔ اور اُس کے شانوں اور سینے پر آگرا۔ اُس کا لباس اُس کے جسم سے چپک گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چھپر تک پہنچی۔ گاگر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اتارنے کے لئے جھٹکا جو دیا تو دھڑاک سی آواز آئی۔ گاگر کی گردن امامی کی انگلیوں میں تھی۔ اور دھڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ پانی ایک ندی کی صورت میں دور تک بہتا چلا گیا۔

عورت کھاٹ سے اچھل کر امامی کے پاس آئی۔ اور بغیر سوچے سمجھے چار پانچ دوہتڑ جما دیئے۔ امامی کے گال لال پڑ گئے آنکھوں میں پانی آگیا۔ ہونٹوں کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ بُت بن کر رہ گئی۔ اور اس کی باتیں سنتی رہی "ڈائن، تیرے نخروں کی کوئی حد بھی ہے؟ پرسوں پیالہ توڑ ڈالا۔ کل اپنے چچا کا حقہ تازہ کرتے کرتے اُسے اوندھا دے مارا۔ آج گھڑے کو موت کے گھاٹ اتار کر ٹک ٹک مجھے گھور رہی ہے جیسے میں نے ہی تو کہا تھا کہ اسے زمین پر دے مار۔ بدذات، تُو تو میری گردن پر سوار ہوئی جا رہی ہے!"

امامی گاگر کے ٹکڑے اٹھا کر چھپر سے دور جھاڑی میں پھینک آئی۔ بیمار کُتیا چیخ کر جھاڑی سے اُٹھی۔ اور تالاب کے پانی میں گھس گئی۔ امامی کے آنسو آگئے۔

واپس آئی اور پائنتی پر بیٹھ کر اُس کے پاؤں دبانے لگی روتی رہی اور اُسکے

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک ڈھلک کر اُس کی جھولی میں گرتے رہے۔ موٹے کھدر کی میلی چیکٹ قمیص بھیگ گئی۔ آنکھوں کے ڈوروں میں آگ سی جلنے لگی کنپٹیوں میں جیسے کوئی چاقو چبھو رہا ہے۔ وہ چاہتی تھی۔ زور زور سے روئے اور دنیا کو بتائے کہ میں بچپن سے یہاں عذاب جھیل رہی ہوں۔ مجھے کھانے کے لئے جو کی روٹی ملتی ہے اور پینے کے لئے اُس غلیظ جوہڑ کا سبز پانی۔ ایک ایک گھونٹ میں دس دس کیڑے ——— میرے لئے اب تک میرے چچا جی کو ایک ٹوٹی کھاٹ کے سوا کچھ میسّر نہیں آیا۔ میں کون ہوں، میں یہاں کیسے آئی؟ میرے ماں باپ کون ہیں۔ میں پیدا ہوتے ہی اس دنیا میں اجنبی بن کر کیوں رہ گئی!"

اُس کے دل سے یہ آوازیں روزانہ اُٹھتی تھیں۔ اور اُس کی رگ رگ میں آگ بھڑکا کر پھر دل کی گہرائیوں میں سو جاتی تھیں۔ جیسے کھلے سمندروں میں طوفان آتے ہیں۔ تھوں سے موجوں کو اوپر اچھال کر چلے جاتے ہیں۔ اور موجیں پھر نیچے جا کر سو رہتی ہیں!

اُس کا چچا اُس پر مہربان تھا۔ مگر اُس کی مہربانی صرف اس حد تک تھی۔ کہ وہ اُسے جھڑکتا نہ تھا۔ کبھی کبھی سر پر ہاتھ پھیر دیتا تھا۔ گاہے گاہے "بیٹی" کہہ کر پکار لیتا۔ وقتاً فوقتاً بیوی کو یہ بھی کہہ دیا کرتا کہ اُسے گیہوں کی روٹی پکا دیا کرے۔ اس لئے امامی کو اُس سے اُنس تھا۔ اور جب وہ آتا تھا تو وہ سمجھتی تھی کہ یک بیک اُس کے سر پر سے کسی نے ایک بھاری چٹان اُٹھا کر پرے دھر دی ہے!

لیکن پھر بھی وہ اس آباد گھر میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ چچی کے پاؤں پنڈلیاں دباتے دباتے اُس کی اُنگلیوں میں ورم آ جاتا۔ اور جب اُس کی گرفت کچھ

ڈھیلی پڑنے لگتی تو چچی کا بھاری ہاتھ اس زور سے اُس کے تالو پر پڑتا کہ وہ سمجھتی اُسکا سر دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے!

کئی بار وہ اونچی چٹانوں سے نیچے کودپڑنے کو تیار ہو جاتی۔ کئی بار خوفناک تالاب میں ڈوب مرنے کو دوڑ پڑتی لیکن اُسے جو چٹان ملتی، وہ پست ہوتی۔ اور جو تالاب ملتا وہ پایاب ہوتا۔ پھر وہ مرنے سے کچھ نہ کچھ ڈرتی بھی ضرور تھی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو دم توڑتے دیکھا تھا اور وہ سوچا کرتی تھی۔ کہ مرنا ضرور کوئی تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ کیونکہ اُس کی سہیلی موسم سرما میں نرم و گرم بستر پر لیٹے ہوئے بھی پسینے سے شرابور ہوتی جارہی تھی۔

اُس کے دل کی خلوتوں سے راتوں کو ایک دبا دبا نغمہ بلند ہوتا ——— ایک دکھی دکھی نغمہ ——— کاش میرا بھی کوئی غمگسار ہوتا۔ کاش مجھے بھی کوئی تسلیاں دے سکتا! کاش میں بھی کسی کو اپنا کہہ کر پکار سکتی۔ ہم دن کو اکٹھے ویران گھاٹیوں میں آوارہ پھرتے رہتے، راتوں کو ہم اکٹھے آسمان پر نگاہیں گاڑ کر تارے گنتے گنتے سو جاتے ——— ایک سہیلی تھی۔ وہ بھی چل بسی! اب میرا اس دنیا میں کون ہے! ——— میرا اس دنیا میں کون ہے!

امامی کو اپنے متعلق یہ بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ کہ اِس دنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ گاؤں کے سارے خوبرو نوجوان اُس کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اور ایک نوجوان دوست محمد کے متعلق تو یہ بھی مشہور ہو گیا تھا۔ کہ وہ "ہیر" گانے گاتے ہیر کی جگہ امامی کا نام لگا دیتا ہے اور رانجھے کی جگہ اپنا۔ چوپال والے اُسے اِس پر جھڑکتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ سچی بات کو چھپانا اُس کی فطرت میں نہیں!

امامی نے بھی اُڑتی سی خبر سُنی کہ دوست محمد نے رات کو ہیر کی جگہ امامی کا نام لیا تھا۔!

اور اگر چچا چی سُن پائیں!

مگر امامی کے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے دل نے یک بیک ایک پھریری لی۔۔ اُسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ۔ اُس کے سینے میں بھی ایک دل ہے۔ اور وہ دھڑکتا بھی ہے۔ وہ جب غلیظ جوہڑ سے پانی بھرنے گئی تو بہت دیر تک سبز پانی میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اور گاگر اٹھاتے ہوئے بڑے تُر میلے، مدھم مگر میٹھے انداز میں بولی "میرا رانجھا۔!"

اُسے محسوس ہوا جیسے بیری کے خشک پتوں پر کسی نے ہولے سے قدم رکھا ہے! کوئی اس کی طرف آرہا ہے! اس چلچلاتی دھوپ میں کسی کا اِس گندے بدبودار جوہڑ پر کیا کام! اُس نے خوفزدہ ہرنی کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ گاگر نے چھلک کر اُس کا منہ بھگو دیا۔ ایک طرف سے دوست محمد ڈرتے ڈرتے قدم اُٹھاتا اُس کی طرف آرہا تھا۔ وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

"امامی"

"کون ہو تم؟" اُس نے مڑے بغیر پوچھا

"تمہارا رانجھا!"

امامی وحشت زدہ ہو کر بھاگنے لگی۔ گاگر چھلک کر آدھی رہ گئی۔ کپڑے بھیگ گئے بھیگا ہوا آنچل گھسٹتے گھسٹتے مٹی میں لت پت ہو گیا۔ چھپر تلے پہونچی۔ گھڑا ایک طرف رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چچی پرلی طرف مکان کے سامنے بیٹھ کر کریلے

کتر رہی تھی۔ پکاری" ہائیں! کیا جوہڑ میں کپڑوں سمیت نہاتی رہی ہے! کلموہی، یہ ڈھنگ تو اچھے نہیں۔ نورج تو توکل کلاں یہاں سے بھاگ کھڑی ہوگی!"

لیکن امامی کی سانسیں الجھی ہوئی تھیں۔ اور رنگ اڑا ہوا تھا۔ اُس نے بہت دیر کے بعد تالاب کی طرف دیکھا۔ بیری کا ٹنڈ منڈ درخت تالاب میں اپنے کبڑے جسم کا عکس دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کے آخری ٹنڈ پر ایک کوا بیٹھا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"میرا رانجھا" امامی نے گاگر کو ایک جگہ جماتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اُسے اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ مگر اُس رات کی بیداری میں ایک کیف تھا جو اُسے بُری طرح مخمور کئے ڈالتا تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ وہ یونہی جاگتی رہے۔ ابد تک جاگتی رہے! اُس کے پپوٹے یونہی بھاری رہیں۔ اُس کا سینہ یونہی جلتا رہے۔ اُس کے بھاری پپوٹوں اور جلتے سینے پر اُس کا رانجھا...... وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا سوچے۔

غلیظ جوہڑ سے وہ اپنے پینے کے لئے پانی بھرنے جاتی تھی۔ ورنہ چچا کے لئے تو چشمے سے پانی آجاتا تھا۔ وہ خود بھی چشمے پر چلی جاتی مگر گھر کے کام کاج میں ہرج ہوتا تھا اور چچی کی گالیاں اتنی سخت تھیں کہ ایک بار مسجد کے مولوی جی نے سنکر کانوں میں انگلیاں ٹھونس دی تھیں۔

دوسرے دن وہ پھر اُسی وقت جوہڑ پر گئی۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جھاڑیوں کے آس پاس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

"میرا رانجھا" اُس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ اُسے ایک انگڑائی آگئی۔ بازو

پورے زور سے تانے اور سر پیچھے پھینکتے ہوئے پکاری "اف!"

وہ سمجھی کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ "امامی" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی "میری ہیر"۔

"میرا رانجھا" اس نے ایک اور انگڑائی لی۔ اور گاگر بھرنے کے لئے پنڈلیوں تک کپڑا اٹھا کر جوہڑ میں گھس گئی۔ گھم گھم گھم ——— گاگر بھر گئی! اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ چھم چھم چھم۔ اس کا جی بھر آیا! گاگر سر پر رکھی اور چھپر کی طرف جانے لگی۔

"امامی" کوئی بیری کے تنے کی اوٹ سے بولا۔

"کون؟" اس نے پلٹ کر پوچھا۔

دوست محمد درخت تلے کھڑا انگلیاں چٹخا رہا تھا "تمہارا رانجھا"۔

آج وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی چھپر تلے آ گئی۔ وہاں پہونچ کر گھڑا رکھتے ہوئے ادھر دیکھا۔ دوست محمد اسی حالت میں کھڑا تھا۔ امامی کو جیسے کسی نے ہوا میں اچھال دیا ہے چکرا سی گئی۔ اچانک چچی کی آواز آئی "اری کھڑی کس کو تاک رہی ہے؟ وہ چھوکرا کون ہے۔ جوہڑ پر اسی سے اشارے ہو رہے ہیں نا؟ بدذات، کمینی! اسی لئے جوہڑ پر سارا دن گذار دیتی ہے تو؟ دن دہاڑے گھر کے سامنے یہ لچھن! کیا تو نے مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے؟ ارے ڈائن۔ کنواری لڑکی جوان چھوکروں سے یوں تالاب میں کشتیاں کھیلے! زمانہ بدل گیا۔ آنکھوں میں حیا نہ رہی! کیا اندھیر نگری ہے کہ میرے سامنے ہی اپنے عاشق میاں سے اشارے ہو رہے ہیں۔ تجھے ہیضہ آئے۔ تو نے میرے مالک کی ناک کاٹ کر رکھ دی، تجھے قبر بلائے تو نے یہ کیا کیا؟"

امامی کو اب محسوس ہوا کہ دوست محمد کا بول دن کے وقت جوہڑ پر آ کر اسے چھیڑنا

اور پھر خود اُس کا چھپر تلے کھڑے ہو کر اُسے گھورنا پڑے۔ رجے کی نادانی اور عاقبت نااندیشی پہ اگاؤں والیاں دوڑی آئیں۔ چچی کی آواز میں ایک جادو تھا کہ سب کھچی چلی آئیں۔ کیا ہوا کیا بات ہوئی؟" سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ سب امامی کو جھکی بھوؤں اور خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگیں۔

ایک بڑھیا چارپائی پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "نوج ذرا ایک پل تو چپ ہو جاؤ۔ تمہاری زبانیں ہیں کہ قینچیاں۔ کوؤں کی طرح کائیں کائیں کئے جا رہی ہو۔ کچھ کہنے سننے بھی دو۔ لو چپ ہو جاؤ ایک پل کے لئے۔!"

خاموشی چھا گئی۔ امامی چھپر میں ایک بے جان ستون کی طرح دم بخود کھڑی تھی۔ کسی احساس نے اُس کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اور دل میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ اُس کی آنکھیں جھپکتے جھپکتے رک گئیں۔ اُس کا دل دھڑکتے دھڑکتے ٹھہر گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے! اب کیا ہوگا! یہ کیا ہوا!"

بڑھیا نے چچی سے پوچھا "لے اب بتا بہو رانی، کیا بات ہوئی؟"

چچی اب رو رہی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ہجوم میں تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی "کیا بتاؤں، ہم جیتے جی مر گئے۔ خاندان کی لاج ملیا میٹ ہو گئی۔ آبرو کی جڑ کٹ گئی۔ میں نے کہا تھا۔ تمہارے بیٹے سے کہ ناگن کو پالنا دانائی نہیں۔ ہو لا جانے کہاں سے اٹھا لایا اور بیٹی بنا کر پالنے لگا۔ اب پتہ چلے گا اُسے کہ تماں، چاہے انگوؤں میں بڑھے پر ہوگا کڑوا۔ میرے سامنے کھڑی چوہڑ پر کسی آوارہ چھوکرے سے اشارے کر رہی تھی۔ میری آواز سن کر وہ تو کھسک گیا اور خود چھپر تلے کھڑی مجھے یوں گھور رہی ہے جیسے بس چلے تو چبا ہی ڈالے گی۔ برسوں سے آدھی رات کو میں اس کا بستر بھی خالی

دیکھ رہی ہوں۔"

سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ امامی کو یہ سرگوشیاں بے شمار سانپوں کی پھنکاریں معلوم ہونے لگیں۔ جو اُسے کاٹ کھانے کے لئے اُس کے آس پاس لمبی لمبی دو دھاری زبانیں نکالے جھوم رہے تھے! آناً فاناً یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ امامی اپنے عاشق سے اشارے کر رہی تھی کہ چچی نے آ لیا۔ اور اب بھیگی بلی بنی چھپر تلے بیٹھی ناخن سے مٹی کرید رہی ہے!

نوجوانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ وہ کون تھا جس نے جوہڑ پر جا کر دن دہاڑے اس مغرور چھوکری سے بات کرنے کی جرأت کی۔ اُس کی آنکھوں میں تو بجلی کی چمک ہے! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو آنکھ بھر کر دیکھے تو بھسم کر ڈالے!

"دوست محمد ہو گا دوست محمد۔" ایک گبرو بولا "کل ہیر کی جگہ امامی پڑھ رہا تھا۔"

"ارے چھوڑو بھی۔ اُس میں اتنا بل کہاں! کوئی اور من چلا ہو گا۔"

دوست محمد بھی اُس مجمع میں موجود تھا۔ بولا "کوئی منچلا ہو گا!"

اُس کا من پھیلنے لگا اور ایک ہی پل میں وہ ساری کائنات پر محیط ہو گیا —— ساری کائنات پر —— جس میں دوست محمد اور امامی کے سوا اور کچھ نہ تھا —— وہ مبہوت سا ہو گیا۔ جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہے۔ ایک دوست نے اُسے جھنجھوڑا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ارے وہ منچلا مجھے ملے تو اُسے گلے سے لگا لوں!"

سب گبرو ہنسنے لگے! دوست محمد جی ہی جی میں اُن گبروؤں پر ہنسنے لگا۔

اب جوہڑ پر کون ملے۔ چچی کھاٹ سامنے ڈال کر بیٹھ جاتی اور امامی گھڑا پانی میں

ڈال کر سر پر رکھتی اور جھپاک سے چھپر تلے پہنچ جاتی ۔ اُس کے چچا نے بھی اُسے بہت مدت کے بعد بدبخت سست کہا تھا۔ اس لئے اب بھلائی اسی میں تھی کہ من کی آگ دبا کر بیٹھ جائے اور جو پڑے وہ جھیلے! امامی کی حالت اُس پھول کی سی ہو گئی جو اپنے ہی بوجھ سے ایک طرف جھک گیا ہو۔ کونپل ٹوٹ گئی ہو اور اب پھول آہستہ آہستہ مرجھا رہا ہو۔!

ایک رات وہ کھاٹ پر پڑی تھی۔ گہرے سیاہ آسمان پر ٹکے ہوئے ننھے ننھے ستارے پسینے کے اُن قطروں کی طرح مضطرب نظر آ رہے تھے، جو کسی پیاسے انسان کے ماتھے پر آہستہ آہستہ اُبھر رہے ہوں! اور جوہڑ کے کنارے بیری کا درخت اپنے بازو آسمان کی طرف اُٹھائے کسی بیمار ملزم کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

نہ جانے اُسے کیا خیال آیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چچی گہری نیند سو رہی تھی چچا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کھسکتی ہوئی چھپر تلے آ گئی۔ اُسے بیری کے درخت سے ڈر سا محسوس ہونے لگا، جو سیاہ آسمان کے بالمقابل سیاہ بازو پھیلائے جیسے اُسکا کلیجہ نوچ لینے کا منتظر کھڑا تھا۔ لیکن وہ لڑکھڑاتے اور رُکے رُکے قدموں سے آگے بڑھتی گئی ——— آہستہ آہستہ ——— ہولے ہولے ——— جیسے اُس کے پاؤں تلے کانچ بچھا ہوا ہے۔ اور اُسے اُس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ دامنگیر ہے۔ جوہڑ کے کنارے پہنچی تو کالے پانی میں ستاروں کے دُھندلے عکس دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ نیچے آسمان کی طرف گر جائے گی۔ نیچے اوپر آسمان اور جیسے وہ بیچ میں کسی نامعلوم قوت کی وجہ سے معلق کھڑی ہے۔ وہ گھبرا کر وہیں بدبودار کیچڑ پر بیٹھ گئی! ——— اور خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں!

بیری کے درخت کے تلے کسی نے خشک پتّوں پر دھیرے سے قدم دھرا!

بھوت!

اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا!

دوسرا قدم!

تیسرا!

چوتھا!

امامی کو جیسے کسی نے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا ہے!

وہ گھبرا گئی۔ زبان تالو سے لگ گئی۔!

قدم مڑ گئے اور بیری کے تنے کا چکر کاٹ کر پھر اُسی طرح آہستہ آہستہ خشک پتوں پر پڑنے لگے۔

اُس کی سانسیں بگولے بن گئیں!

یکایک سرگوشی کی سی آواز آئی "میری ہیر"

"میرا رانجھا" امامی نے زیرِ لب یہ الفاظ دُہرائے۔ گردن اُٹھا کر اُس طرف دیکھا ——ایک سایہ بیری کے تنے کے اردگرد طواف کر رہا تھا!

"کون ہو تم؟" گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اِنسان!"

سایہ اُس کے قریب آگیا اور اُس پر جھک گیا "تم کون ہو؟"

"امامی"

"میری ہیر"

نیچے جوہڑ کے کالے پانی اور اوپر آسمان کے سیاہ سینے پر تارے ناچنے لگے۔ بیری کا درخت اپنے بازو ہلانے لگا۔ تالاب کے کنارے خشک گھاس میں کسی جھینگر نے نیند میں نغمہ چھیڑا اور چپ ہو گیا۔ گاؤں میں دو چار کتے ایک ساتھ بھونکے اور پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ کائنات نے ایک کروٹ بدلی! امامی اٹھ کھڑی ہوئی ”تم کون ہو؟“

”تمہارا رانجھا“

”اس دن تم مجھے گھورتے رہے۔“

”ہاں۔“

”بڑی بدنامی ہوئی۔“

”میں نے بھی سنا تھا۔“

”تم یہاں کیوں آئے؟“

”روز آتا ہوں۔“

”روز آتے ہو؟“

”ہاں روز آتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”تمہارے لئے۔“

”میں تو چھپر کے اس پار سو رہی ہوتی ہوں۔“

”میں چھپر کے اس پار جاگ رہا ہوتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”تمہارے لئے“

"کیا مطلب؟"

"کیا بتاؤں"

"تم میرا پیچھا چھوڑ دو"

"کیوں"

"یہ اچھی بات نہیں ہوتی"

"لیکن بدنامی تو ہو چکی"

خاموشی چھا گئی۔ دونوں کی سانسوں کی آواز ایک دوسرے کو سنائی دینے لگی۔ دونوں سر جھکائے کیچڑ میں انگلیاں پھیرنے لگے!

"اچھا میں اب جاتی ہوں"

"پھر کب ملو گی؟"

"کل!"

"یہیں؟"

"یہیں"

"اچھا!"

"اچھا"

وہ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتی چھپر تلے آ گئی۔ مڑ کر دیکھا۔ اندھیرا وسیع میدان میں سنسنا رہا تھا! کیا یہ خواب تھا یا بیداری۔ اس نے اپنے سینے پر زور سے چٹکی لی! وہ جاگ رہی تھی: میرا اچھا! اس نے اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ بہت دیر تک ابھرتا ہی چلا گیا! اس کی چچی ابھی تک سو رہی تھی: نہ اپنی کھاٹ پہ

پڑ رہی اور صبح تک یونہی پڑی رہی! آج اسے بخار سا ہو رہا تھا!

"مجھے آج بخار ہو رہا ہے۔ میں کوئی کام نہیں کر سکوں گی۔" وہ علی الصبح انگڑائی لے کر تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"تجھے بخار لے جائے۔ تو اب میرے کام کی نہیں رہی۔" چچی نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ تمام دن دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔ پڑوسنیں آئیں اور چچی سے پوچھنے لگیں

"امامی کو کیا ہو گیا؟"

"سانپ سونگھ گیا۔"

امامی جی ہی جی میں چچی پر مسکرا دی!

چچا آئے۔ "کیا ہوا امامی؟"

"کچھ نہیں۔"

چچی بولی: "صبح سے بخار کا بہانہ لے کر بیٹھی ہے، سچ کہوں، اس کے ہوتے میں نہ جی سکوں گی۔"

چچا نے امامی کی نبض دیکھی: "اوہ۔ بڑا گرم ہے اس کا جسم۔ اری پڑوسن سے چائے کی چٹکی تو مانگ لا۔ امامی کو تو بہت سخت بخار ہو رہا ہے!"

امامی جی ہی جی میں چچا پر مسکرا دی!

رات ہو گئی۔ چچا پھر کسی کام پر چلے گئے اور چچی کو تاکید کر گئے کہ امامی کی دیکھ بھال کرے کہیں وہ بخار کی شدت سے رات کو بے ہوش نہ ہو جائے۔ موقع پا کر امامی کھاٹ سے کھسک کر جوہڑ کی طرف چل دی! اور اُدھر سے بیری کے تنے کے پاس

سے ایک سایہ کھسکا اور اُس کی طرف آیا۔

"امامی"

"دوست محمد"

"میری ہیر"

"میرا رانجھا"

امامی نے بہت مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے ——— بہت مشکل سے ——— اور بہت آہستہ آہستہ! لیکن وہ سمجھی، اُس نے اپنے دل کا سارا بوجھ اتار کر جوہڑ کے غلیظ پانی میں پھینک دیا ہے! اور جیسے اب اُس کے پَر لگ گئے ہیں۔ اور وہ اُڑ کر اس ٹنڈ منڈ بیری کی آخری پھننگ پر بیٹھ کر اپنے رانجھا کے ہمراہ "ہیر وارث شاہ" گا رہی ہے!

"مَیں بہت دیر سے تمہارا منتظر کھڑا تھا۔"

"مَیں سمجھی تم ابھی تک نہ آئے ہو گے۔"

"مَیں شام سے یہیں بیٹھا ہوں۔"

"اوہو!"

"مَیں نے تمہیں ایک بار گھاٹ پر بیٹھے دیکھا تھا۔"

"اچھا!"

جوہڑ کے کنارے جھینگر چیخ کر چپ ہو گیا۔ اور دور گاؤں میں کتنے ایک ساتھ بھونکے اور خاموش ہو گئے۔!

"امامی" دوست محمد نے رازدارانہ لہجے میں کہا "امامی۔ تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے

کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں!"

امامی خاموش رہی۔

"امامی، میں اس لئے آتا ہوں کہ تم سے وعدہ لوں کہ تم میرے بغیر اور کسی کی نہ بنو گی۔"

امامی رو دی، بولی: "میں چچا چچی کے بس میں ہوں دوست محمد۔"

"یہ زنجیریں ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔"

"نہ بھی ٹوٹیں تو میں تمہاری ہوں۔"

"امامی۔"

دونوں کے دماغوں میں گونج سی پیدا ہو گئی۔ جیسے وہ کسی برق رفتار گھوڑے پر سوار پہاڑوں کی چوٹیاں اور سبز گھاٹیاں اور گھنے جنگل الانگتے پھلانگتے کہیں اڑے جا رہے ہوں۔

اس کے بعد ایک روز دوست محمد شہر کے سفید پوشوں کو اکٹھا کر کے امامی کے چچا کے ہاں لے آیا۔ اور امامی کے رشتے کا طالب ہوا۔ وہ بھی شاید امامی سے دامن چھڑانے کا منتظر بیٹھا تھا۔ پکار اٹھا: "دینے کا مال ہے، انکار کیا کروں۔"

اتنا سستا سودا!

امامی نے بھی یہ خبر سنی۔ خوش ضرور ہوئی۔ لیکن دوست محمد کو رانجھا اور اپنے آپ کو ہیر کہنے سے ہچکچانے لگی۔ انہوں نے مصیبتیں جھیلیں۔ ہم نے صرف دو چار راتیں آنکھوں میں کاٹیں وہ مر نے مر گئے لیکن جی بھر کر ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ ہماری کل کلاں شادی ہو جائیگی نہ میں ہیر بن سکتی ہوں، نہ وہ رانجھا۔ دوست محمد اگر پہلے دن ہی میرا رشتہ پوچھ لیتا تو یہ دو چار دن کی الجھنیں بھی نہ دیکھنا پڑتیں۔

شادی سے ایک دن قبل شام کا کھانا کھا کر امامی دیوار سے لگی بیٹھی تھی کہ چھپر میں

اسے دوست محمد کی آواز سنائی دی۔ وہ کھسکتی کھسکتی کھاٹ کی اوٹ میں چھپر کے قریب ہو گئی چچی کہیں پڑوس میں چلی گئی تھی۔ اس کا چچا دوست محمد سے باتیں کر رہا تھا۔

"بیٹا دوست محمد! امامی کو تمہارے ہاتھ سونپ دینے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہیں ایک راز بتا دوں۔ مبادا بعد میں تمہیں یہ بات معلوم ہو اور تم وہ کر بیٹھو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اپنی آخرت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم جانتے ہو، امامی میری بیٹی نہیں۔ لیکن تمہیں یہ خبر نہیں کہ میں نے اسے کہاں سے حاصل کیا۔ مدتیں گزریں میں بھی تمہاری طرح جوان تھا مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی بہت عرصے تک ہم ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ اور آخر ایک دن یہ سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ کہ وہ ماں بننے والی ہے —— اور باپ! —— وہ میں ہی کمبخت تھا۔!

"دوست محمد تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میرے دل پر کیا گزری مجھے اس لڑکی سے محبت تھی اور اب عام دنیا کی طرح میں اسے یوں اُجاڑ راہ میں چھوڑ کر اکیلا آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے اسے اس جوہڑ کی اس بیری تلے یقین دلایا کہ میں اس کا ہوں اور اسی کا رہوں گا۔ میں اسے اس گھر سے بھگا کر ایک کھنڈر میں لے گیا۔ وہاں اس کے ایک بیٹی ہوئی۔ وہی تمہاری امامی ہے۔"

امامی کی آنکھ کی پتلیاں جیسے چنگاریاں بن کر باہر اُبل پڑیں گی۔ اس نے چاہا۔ کھاٹ کے پلئے سے اپنا سر پھوڑ ڈالے —— ناجائز اولاد —— امامی کو محسوس ہوا جیسے وہ اس حقیر چوہیا سے بھی کمتر ہے۔ جو گلی میں کسی پتھر سے پچک کر کوڑے میں مل گئی ہو!

بہت دیر کے بعد دوست محمد بولا۔ "اس کی ماں؟"

"وہ اسی دن مر گئی۔ کھنڈر میں زچہ کی خبر گیری کون کرتا۔ وہ اسی دن مر گئی! اور میں نے

اُسے چند دوستوں کی مدد سے دفنا دیا اور بچّی کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ جنگل میں بے یار و مددگار لڑکی پڑی ملی اور میں اُسے اُٹھا لایا ——— دوست محمد کیا یہ باتیں سُن کر تمہارے دل میں امامی سے نفرت تو پیدا نہیں ہو گئی ؟"

" نہیں ۔"

امامی تمام رات جاگتی رہی ۔ اس کی آنکھیں سُوج گئیں ۔ کپڑے بھیگ گئے ۔ ہونٹ پھٹ گئے ۔

صبح اُٹھی ۔ جوہڑ پر پانی بھرنے چلی گئی ۔ ایک بار کیچڑ سے لت پت ایک سیار کُتیا اُس کی راہ کاٹ کر جھاڑی میں گھس گئی ! ایک طرف سے گاؤں کا بوڑھا کمہار گدھا لئے آ رہا تھا ۔

" آج صبح صبح کدھر گئے تھے چچا ؟" امامی نے پوچھا

" قصبے میں ۔"

" کیوں ؟"

" دوست محمد کا اسباب لاری کے اڈّے پر چھوڑنے ۔"

" کدھر گیا وہ ؟"

" بنوں ۔ اُس کی نوکری لگ گئی ہے نا ۔"

" ارے ———!"

امامی کے ہاتھوں سے اُس کی گاگر چھوٹ کر جوہڑ میں جا گری ۔ لہروں کے دائرے جھلمل کرتے دور تک پھیل گئے اور بیری کا ٹنڈ منڈ درخت باز و ہلا ہلا کر ناچنے لگا ۔

چوری

دن بھر ٹھانیدار کے لئے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے بعد غریب منگو گلی کے ایک نکڑ پر دیوار سے پیٹھ لگا کر سستانے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی نظریں اپنے پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایڑیوں میں دراڑیں سی پڑگئی تھیں۔ اور انگلیوں سے خون پھوٹ کر ناخنوں کے کنارے پر جم گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھا۔ اُس کو اپنے گھر آٹا گوندھنے جانا تھا۔ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ اور وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ ایک جگہ ایک بزرگ کے ذریعے کچھ بات چیت کی تھی۔ لیکن لڑکی والے پانچ سو رُپے طلب کرتے تھے۔ اور اُسے پیٹ بھرنے کے لئے پانچ پیسے بھی مشکل سے میسّر آتے تھے۔ خاموش ہو رہا۔ اُس نے سوچا۔ ویسے بھی گذر ہو ہی جائے گی۔ یہی سمجھ لوں گا کہ شادی کرتے ہی بیوی مر گئی اور میں رنڈوا ہو گیا۔ پھر بھی کبھی کبھی

جب کوئی عورت سر پر گھاگریں رکھے۔ اٹھلاتی ہوئی، سبلینہ تانے اُسے کنکھیوں سے دیکھ کر گذر جاتی۔ یا دُور کسی مکان کی چھت پر کسی دھوپ سینکتی ہوئی دوشیزہ کی نظریں اُسکی نظروں سے لڑ جاتیں تو وہ اپنی زندگی میں بہت بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔ لیکن جلد ہی پیٹ کے دھندوں میں پھنس کر وہ اِس تکلیف دِہ احساس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

اُس نے دو چار قدم اٹھائے۔ اچانک گاؤں سے باہر دور ایک گولہ چھوٹنے کی آواز آئی۔ اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بھی اب صاف سُنائی دینے لگیں "کسی کی برات آ رہی ہے!" اس نے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس طرف آنے لگا۔ اور پھر کنوارے اور رنڈوے تو براتیں دیکھنے کے دلدادہ ہوتے ہیں!

اُس سے ایک شخص نے پوچھا "کدھر منگو۔ خیر تو ہے؟"

"خیر ہے بھائی۔ بس ادھر ڈھول کی آواز آئی میں نے کہا چلو رونق ہی دیکھ آئیں کس کی برات ہے آج"؟

"کیا کروگے پوچھ کر ــــ جھوٹی براتیں!"

"جھوٹی براتیں؟" منگو نے متعجب ہو کر پوچھا

"ہاں جھوٹی براتیں ــــ سچی برات تو وہ ہوگی جس میں تم سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار ہو گے یا"

منگو جھینپ گیا اور وہ شخص ہنستا ہوا ایک طرف چلا گیا

دور سے اُسے بے شمار مشعلیں نظر آئیں۔ جن میں بار بار کالے کالے ہاتھ

کالی کالی صراحیوں سے تیل ڈالتے تھے۔ آگے آگے علاقے کے مشہور میراثی تھے دو ڈھول جن سے ریشم اور موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ دو شہنائیاں جن کے بندوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ایک بین باجا۔ جس کی بے شمار تونبیوں سے لٹکتے ہوئے سنہری پھندنے چھم چھم کر رہے تھے۔ میراثیوں کے پیچھے سوار تھے۔ جن کے تمیلے موروں کی دموں سے بھی کچھ زیادہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور جن کی مونچھیں آسمانوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ کئی سوار اپنی مریل مریل گھوڑیوں کی پسلیوں میں ایڑیاں گھسیڑ گھسیڑ کر انہیں ناچنے یا کم از کم اپنی گردنیں اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے جو نفرت انگیز انداز میں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ کئی سوار اپنی خوبصورت بنی ٹھنی گھوڑیوں کو نچانے کی کوشش میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے اور چیخ کر ارد گرد کے لوگوں سے امداد کے طالب ہوتے تھے۔ ان کے پیچھے چار اونٹ تھے۔ جن کے ماتھوں پر گھٹنوں پر گردنوں میں سینوں پر موٹے موٹے گھنگھروؤں کی مالائیں بندھی ہوئی تھیں اور جن پر لدے ہوئے کجاووں میں کئی ایسی حسین لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اپنے آپ سے شرماتی اور لاج سے سکڑی جاتی تھیں۔ اُن کے گال تمتمائے ہوئے تھے اور اُن کے کانوں میں لٹکتے ہوئے بُندے چھم چھم کر رہے تھے۔ ہوا میں لہراتی ہوئی اوڑھنیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ کئی بار اُڑتی ہوئی پریاں معلوم ہوتی تھیں جو اپنے ارضی محبوب سے مل کر واپس ستاروں کی طرف جا رہی ہوں۔ کئی ایسی بھی تھیں جو اپنا شباب گزر جانے پر بھی اس طرح اکڑی بیٹھی تھیں۔ جیسے سارے مجمع کی نظریں صرف ان پر پڑ رہی ہیں۔ حالانکہ ان کی طرف صرف ادھیڑ عمر کے رنڈوے ہی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہونٹ لال

کر رکھے تھے اور بے شمار زیوروں کے بوجھ سے کجاووں میں جھک جھک جاتی تھیں۔ ان سب کے پیچھے پیدل چلنے والے تھے جن کے سرسراتے ہوئے لباسوں سے عطر کی لپٹیں آرہی تھیں۔ فوجی سپاہیوں کا سب سے بڑا تحفہ عطر ہی تو ہے جس سے وہ لڑکیوں پر اپنا رعب جما سکتے ہیں۔

منگو بھاگا بھاگا آیا اور دو تین لجاتی لڑکیوں کو گھورتا اور ماتھے سے پسینہ پونچھتا پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ جب گولے چھوٹتے تھے اور گھوڑے بھڑکتے تھے تو برات میں نئی زندگی دوڑ جاتی تھی۔ جب شہنائی والے سر کو پیچھے لے جا کر شہنائیوں کا منہ آسمانوں کی طرف کرتے تھے اور ایک لمبی تان کھینچتے تھے اور ادھر سے پھلجھڑیاں تیر کی طرح آسمان پر جا کر نیلے پیلے سرخ اور سبز شراروں کی شکل میں اپنے پیچھے لکیریں چھوڑتی ہوئی واپس نکلتی تھیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موسیقی کے جادو سے آسمان کے تارے کھنچ کھنچ کر شہنائیوں میں سما جانے کے لئے اڑے آرہے ہیں۔

رات کا چہرہ خوشی کی وجہ سے تمتما اٹھا تھا۔

برات گاؤں میں داخل ہوئی۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کر سجی ہوئی اور بنی ٹھنی لڑکیوں کو دیکھنے لگے۔ منگو کے جی میں آئی کہ چلو دولہا تو دیکھیں۔ آخر وہ خوش قسمت کون ہے جو ہمارے گاؤں کی کوئی لمبے لمبے بالوں اور گلابی گلابی رخساروں والی الھڑ لڑکی لینے آیا ہے۔ وہ تو نظر ہی نہیں پڑتا۔ وہ پیدلوں کے مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے ہی والا تھا۔ کہ شور مچ گیا۔ "میرا بٹوا! میرا بٹوا چوری ہو گیا۔" ——

اور اچانک بے شمار ہاتھ منگو کے کاندھے پر پڑے: "کدھر بھاگا جا رہا ہے۔"

بدمعاش۔ بدذات۔"

منگو نے مڑ کر دیکھا۔ تیل اور گھی سے چمکتے ہوئے چہروں میں لال آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں۔ برات رُک گئی اور سارے مجمع نے منگو کو گھیر لیا۔

تمام برات پر پہلے تو ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ پھر ادھر اُدھر سے سرگوشیوں کی سرسراہٹ اُٹھی اور اس کے بعد ایک شخص نے بڑھ کر منگو کو بالوں سے پکڑ لیا۔ منگو نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ اس شخص کو کیسے جرأت ہوئی کہ اُس نے ایک غیر گاؤں کے نوجوان کو یوں بالوں سے پکڑ لیا ہے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں غریب ہوں اور مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں کرے گا۔ اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو دیکھا جس میں سے اُس کی چوڑی چھاتی کے بال نظر آرہے تھے ــــ اس پر تمام اسرار منکشف ہو گئے۔

اُس شخص نے کڑک کر پوچھا "کدھر ــ ہے بٹوا؟ کدھر ہے بٹوا کرتے کے نیچے!"

منگو کا خون کھول کر آنکھوں کے ڈوروں میں آگیا۔ اُسے یہ خیال نہ رہا۔ کہ ایک غریب انسان تمام برات سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس کے بازوؤں کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ اُس نے گھونسا تان کر اُس شخص کے جبڑوں میں جما دینا چاہا۔ مگر سامنے ایک گھوڑی پر اُسے گاؤں کا سردار نظر آیا۔ خیالات برقی سرعت سے اُس کے دماغ کی شریانوں میں گردش کرنے لگے "مجھے اپنے شہر کے سردار کے آگے فریاد کرنی چاہئے۔ میں نے کئی بار چوپال پر اس کے پاؤں دبائے ہیں۔ اُس کے گھر کے لئے لکڑیاں کاٹ لایا ہوں۔ اُس کے کاموں پر دن میں تیس تیس کوس

پیدل سفر کیا ہے۔ یہ غیر گاؤں والے میری بے عزتی کر رہے ہیں تو اس میں سارے گاؤں کی بے عزتی ہے، میں نے بٹوا چرایا ہے تو میرے پاس موجود ہونا چاہیئے۔"

——— اُس نے وہیں سے چیخنا شروع کر دیا "ملک جی آپ کا اقبال بڑھے مجھے ان بدمعاشوں نے بے گناہ گھیر لیا ہے" ——— اب اُس کے بالوں پر سے مضبوط ہاتھ علیحدہ ہو چکا تھا ——— "ملک جی۔ مجھ پر یہ ناحق الزام دھر رہے ہیں۔ ملک جی آپ مجھے خوب جانتے ہیں۔ میں نے آج تک کہیں چوری نہیں کی میں غریب ہوں مگر اپنی حلال کمائی سے پیٹ بھرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں سارا گاؤں جانتا ہے۔ خدا جانتا ہے"

اُس نے اپنی آنکھیں بے حد اشتیاق سے سردار کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ منتظر تھا۔ کہ ابھی سردار کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلے گا۔ برات والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اور وہ فخر سے اکڑتا ہوا اپنے گھر آ کر آٹا گوندھنے لگے گا۔

لیکن سردار کی للکار اُس پر بجلی بن کر گری "بدمعاش۔ جیب کترے حرامزادے تجھے شرم نہیں آتی۔ گھر آنے والوں کی یوں خاطر کی جاتی ہے۔ سارے گاؤں کی ناک کاٹ کر رکھدی۔ کدھر ہے بٹوا؟ نکال اسے، نکال" ——— اب اُس کی پیٹھ پر سردار کا پتلا چابک شڑاپ شڑاپ پڑ رہا تھا "نکال۔ ورنہ تیری مشکیں کس کر اور الٹا لٹکا کر مرچوں کا دھواں دونگا، مرچوں کا ———"

"حضور۔ مجھے خدا کی قسم، مجھے قرآن کی قسم، مجھے"

"بٹوا نکال، کہاں رکھا ہے؟ کس جھاڑی میں پھینکا ہے؟ کسے دیا ہے؟ کدھر

ہے بٹوا ؟ کدھر ہے ؟" ——— اور ہر جملے پر اُس کی پیٹھ پہ ایک ایسا چابک پڑتا تھا کہ اُس کی جلد سر سے لیکر پاؤں تک طنبورے کے تاروں کی طرح لرز کر رہ جاتی تھی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی ایک نہیں سنی جائیگی۔ خدا اور قرآن ان کی نظروں میں کھلونے ہیں۔ ان پر قسمیں کوئی اثر نہ کریں گی جیسے بوڑھے کا بٹوا گم تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔" دس روپوں کے سات نوٹ دس روپوں کے سات نوٹ! دس کم اسّی روپے! لوگو! میں لٹ گیا۔ میں نے اس شخص کو تیزی سے بھاگتے دیکھا تھا۔ یہی میرا چور ہے" ——— بوڑھے کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔ اور اُس کے منہ سے جھاگ کے قطرے اڑ اڑ کر اس کی گنجان ڈاڑھی میں چمک رہے تھے۔

سردار کے حکم سے برات آگے بڑھنے لگی۔ اور منگو گاؤں کے دو چوکیداروں کے حوالے کر دیا گیا جو اُسے چوپال پر لے آئے۔ کچھ دیر بعد سارا گاؤں اور سب برات والے چوپال پر آموجود ہوئے۔ اندھیری رات تھی۔ اور ایک نائی کے ہاتھوں میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ تھانے سے ایک حوالدار اور ایک سپاہی بھی بلائے گئے

منگو زمین پر بیٹھا ایک تنکے سے مٹی کرید رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔" جس کمبخت نے بٹوا چرایا ہے۔ وہ مجھ پر رحم کھا کر بٹوا چوپال کے مرکز میں کیوں نہیں پھینک دیتا۔ غریبوں پر لوگ ترس کیوں نہیں کرتے۔ سب میری مصیبت پر مسکرا کیوں رہے ہیں۔ عجیب بات ہے! عجیب قانون ہے! عجیب سمجھ ہے!"

وہ اُٹھ کر حوالدار کے سامنے آگیا۔" حوالدار جی میں آپکے آگے سچی سچی

بات کہہ دوں گا۔ آپ کو یقین آجائے تو خیر۔ نہیں تو آپ کی مرضی کے آگے میرا کوئی بس نہیں۔ سارا گاؤں مجھے خوب جانتا ہے۔ بدقسمتی سے برات دیکھنے چلا گیا ایک بار خیال آیا۔ چلو دولہا تو دیکھ لوں۔ جانے لگا تو شور مچ گیا اور سب نے مجھے آن دبوچا میرے تیز قدموں سے انہیں غلطی ہوئی ہے۔ چور اُن کا کوئی اپنا ساتھی ہوگا"

لیکن حوالداجی کی جیب بھاری ہوچکی تھی۔ وہ مسکرادیئے اور سگریٹ کا دھواں اپنے چوڑے نتھنوں سے نکالتے ہوئے بولے "چوری کرنے والے خود بخود اعتراف کرلیں تو سرکار کو ہمارے محکمہ کی ضرورت ہی نہ رہے۔ تیری ہتھیلیوں پر گرم گرم انگارے دھرے جائیں گے۔ تیرے سینے پر پتھر کوٹے جائیں گے۔ تجھے ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا حوالات میں بند رکھا جائے گا۔ تب تو خود بخود پکار اُٹھے گا "حضور بٹوا فلاں جگہ پڑا ہے"۔ برخوردار ہم پولیس والے ہیں پولیس والے!" اور حوالدار نے اپنی گردن کو کچھ اس طرح ٹیڑھا کیا جیسے وہ زمین و آسمان کو حوالات میں بند کردینے پر قادر ہے!

منگو نے ایک بار سردار کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کے انداز سے انتہائی بےخبری اور بےتوجہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ ایک زمیندار سے گیہوں کے بھاؤ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔

حوالدار کے حکم سے سپاہی نے اُس کی تلاشی لی۔ اُس کی جیب سے ایک چونی نکلی جو اُسے لکڑیوں کا گٹھا بیچنے پر ملی تھی۔ چونی حوالدار کی جیب میں کھسک گئی اور اُسے کہا گیا۔

"جاؤ جہاں بٹوا رکھا ہے لے آؤ۔ ورنہ تمہارا چمڑا اتار لیا جائیگا ——— جاؤ"

حوالدار نے اپنی آنکھیں یوں نکالیں جیسے ابھی تڑاخ سے باہر آپڑیں گی۔ تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔

"جاؤ" حوالدار نے اپنا موٹا ڈنڈا منگو کی گردن پہ جماتے ہوئے کہا "کھڑے کیا تک رہے ہو۔"

"لیکن حضور مجھے کچھ خبر نہیں۔ مَیں کہاں سے لاؤں۔ مَیں نے بڈھے کا نام تو سُن رکھا ہے مگر ابھی تک اُس کی شکل نہیں دیکھی مَیں غریب آدمی ہوں حضور۔"

"لے آؤ بڈھا۔ جہاں رکھا ہے لے آؤ جسے دیا ہے لے آؤ۔ ورنہ —— ورنہ ——"

ڈنڈا منگو کی چھاتی پر آن گرا۔

اُس نے ایک کونے میں مسجد کے مولوی صاحب کو دیکھا تو پکار کر کہا "مولوی صاحب! دیکھئے نا مَیں ——"

"مگر بچے! چوری بُری چیز ہے نا!"

وہ اپنی ان تمام نمازوں کو برباد سمجھنے لگا جو اُس نے اِس امام کے پیچھے پڑھی تھیں!

اُسے حوالدار کا ایک اور دھکا لگا "لے آؤ بڈھا۔"

وہ ناچار سر جھکائے چوپال کی سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ اُس کے پیچھے ایک سپاہی اور دو چوکیدار تھے۔ اچانک ایک شخص تیزی سے اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا "کیوں جی برات والے یہیں ہیں؟"

"ہاں!" منگو نے جواب دیا۔ شاید وہ بھی کوئی براتی تھا۔ کیونکہ اُس کا کلف لگا شملہ اُوپر بہت دور تک چلا گیا تھا۔

وہ چوپال پر چڑھ گیا اور بولا "ارے شیر باز۔ بابا شیر باز یہیں موجود ہو کیا؟"

"ہاں ہاں" نثیر باز اُٹھا ——— یہ وہی بوڑھا تھا جس کا بٹوا کھو گیا تھا!

"مَیں نے رستے میں سُنا کہ تم نے ایک بے گناہ پر بٹوے کی چوری کا الزام دھر دیا ہے۔ حالانکہ تم نے مجھے اپنا بٹوا پکڑا یا تھا۔ کہ کہیں بھیڑ میں گم نہ ہو جائے"۔

"ارے ——— میں تو بالکل بھول گیا۔ تمہارے پاس ہے بٹوا؟" بوڑھے کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک پھیل گئیں!

منگو کا جسم غصّے سے دہکنے لگا۔ چوکیدار اور سپاہی واپس ہو پڑے مگر اُس نے وہیں سے کھڑے ہو کر پوچھا "کیا مَیں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں جاؤ" حوالدار نے انتہائی استغنا سے حکم دیا۔ سارے گاؤں والے منگو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندھیرے میں مل گیا۔

منگو گھر آیا تو اُسے اپنی چوّنی کا خیال ستانے لگا: "میری دن بھر کی کمائی اُس کی جیب میں موجود ہے، یہ کہاں کا قانون ہے؟ مَیں اپنی چوّنی ضرور لوں گا۔ ضرور لوں گا" وہ واپس ہو پڑا۔

چوپال پر پہنچا تو لوگ جا چکے تھے۔ وہ تھانے کی طرف دوڑنے لگا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر لیمپ جل رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اندر جھانکا تو وہی حوالدار اور سپاہی ایک چارپائی پر بیٹھے شیشے کے گلاس میں کوئی سُرخ چیز پی رہے تھے۔

"حضور" اُس نے آہستہ سے کہا۔

دونوں کے ہونٹوں سے گلاس بیک وقت جدا ہوئے۔ اور چارپائیوں تلے رکھ دیئے گئے۔

"کون؟" حوالدار نے پوچھا

"حضور، میں ــــــ منگو۔"

"کیا ہے؟"

"حضور۔ اُس شخص کا بٹوا مل گیا تھا نا؟"

"ہاں۔"

"پھر حضور ــــــ"

"کیا؟"

"میری چوّنی مجھے مِل جائے!"

حوالدار اور سپاہی اس زور سے ہنسے کہ حوالات کی سلاخوں سے بھی ایک گونج سی اُٹھنے لگی۔ منگو ان بے معنی قہقہوں پر متعجب ہو رہا تھا۔ کہ کھڑکی کھڑاک سے بند ہو گئی۔ اور درد کی شدّت سے وہ اپنی ٹھوڑی اور ناک کو انگلیوں میں دبا کر رہ گیا۔

کھیل

بوڑھا جب کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا تو کھاٹ پر گٹھڑی کی طرح سمٹ کر پکارا

"اے رانی۔ گھونٹ بھر پانی پلا دے حلق چھل گیا ہے۔"

رانی باہر دھوپ میں چھاج پٹخا رہی تھی۔ لپک کر اندر آئی اور مٹی کے ایک پیالے میں پانی بھر کر بولی۔" دوا دارو تو جی بہلاوے کے بہانے ہیں بابا۔ کہو تو کل پرسوں پیر جی سے تعویذ لے آؤں۔ کہتے ہیں اُن کے تعویذ کی برکت سے مرنے والے بھی ہنستا کسی سہارے کے اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چلی جاؤں کل؟"

اور بوڑھا پانی پی کر اور الجھی ہوئی بھوری مونچھوں پر اپنی کھدر کی چادر رگڑتے ہوئے بولا۔" کیا کرے گی جا کر، پیر جی کی شان میں گستاخی کروں تو میری زبان جل جائے لیکن اگر اُن کے کلام میں اثر ہوتا تو تیرا شیرو کیوں موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ میں اللہ کے

کرم کا امیدوار بیٹھا ہوں اور ویسے مجھے اب جینے کی کوئی اتنی بڑی آرزو بھی نہیں۔"

رانی بوڑھے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسی گاؤں کے ایک البیلے جوان سے بیاہی گئی اور جس روز اس کی ڈولی پر سے چمکتے اور کھنکتے سکے گزر کر آس پاس بچوں کے جمگھٹ میں بکھر بکھر گئے اور جب اُس نے نئے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اور اس کی ساس نے خالص سونے کا ایک ست لڑا ہار اُس کے زریں جوتوں پر ڈال دیا تو دنیا بھر کی کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے جمِ غفیر میں وہ خود اپنے آپ کو سب سے بلند نظر آنے لگی۔ دو تین مہینے تو گھر سے باہر قدم دھرنے ہی کی نوبت نہ آئی۔ ہر وقت خوبصورت شیرو اس کے سامنے رہتا اور ساس اُسے دیکھ دیکھ کر پڑوسنوں سے کہا کرتی "اللہ اسے ہم سب کی نظرِ بد سے بچائے مگر میں اتنا تو ضرور کہوں گی کہ جہاں میری رانو ایک بار قدم رکھتی ہے وہاں سے سات دن تک خوشبوئیں اُٹھتی رہتی ہیں۔ اور جہاں بیٹھتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جاگیردار جی کی بجلی کی لالٹین پڑی لس لس کر رہی ہے۔ میں تو اپنے بھاگ پر ناز کرتی ہوں۔ کہ آخری عمر میں میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔"

مگر اچانک اس ناز و نعم کی بساط اُلٹ گئی۔ شیرو کبڈی کھیلنے کہیں میلے پر گیا وہاں اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہسپتال لایا گیا۔ زخم میں زہر بھر گیا۔ ہفتہ دس دن تڑپا بلبلایا اور ایک اداس صبح کو جب ہسپتال سے باہر راستے پر کوئی چرواہا بنسری بجاتا جا رہا تھا۔ اُس نے رانی کے زانوں پر دو تین بار سر جھٹکا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ رانی جب گھر واپس آئی تو رونے پیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ اور جب ماتم کی مدت ختم ہوئی تو ایک روز ایک کونے میں سمٹی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ کہ ساس اندر داخل ہوئی اور کڑک کر بولی: "اب تو کب تک میرے شیر کے غم میں نمائشی سوگ منائے گی میرے لال کو

نگل کر اب تو اس گھر کی دانی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اُٹھ کر چکی پیس اور برتن مانجھ اور کپڑے دھو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی تو آج ہی سُن لے کہ دھکے دے کر میکے پہنچا دوں گی تجھے۔ کس کُنگلے گھر میں میرے شبیر کے لیکھ لکھے تھے کہ وہ بجلی کی طرح چمکا اور ہمیشہ کے لئے قبر میں جا سویا۔"

یہ اُس شرمناک رویے کی ابتدا تھی جو آخر میں شدت اختیار کرتا گیا اور جب ایک روز بُڑھیا نے اُس کے سر پہ سے دوپٹہ نوچ کر الگنی پر لٹکا دیا اور کھدر کی ایک بوسیدہ چادر اُس کے منہ پر دے ماری اور بولی "ان رنگ برنگے دوپٹوں سے تو پڑوس کے چھوکروں کو اپنے بس میں لانا چاہتی ہے۔ کُٹنی، کل تو چھت پر کھڑی جاگیردار کے بیٹے سے کیا اشارے کر رہی تھی"؟ —— تو وہ اُٹھی اور بوڑھی ساس کی آنکھ بچاتی اپنے پُرانے گھر آگئی۔ باپ کو سارا حال کہہ سُنایا۔ وہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "اونچی بیری پر ہر کوئی نہیں چڑھ سکتا میری بچی۔ لیکن چھوٹے سے بیروٹے کو ہر راہ چلتا جھٹکائے گا۔ تیری قسمت کہ تیرا مالک اس قدر جلد چل بسا۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں۔ اور بیٹھ پہ من بھر لکڑیاں اٹھا سکتا ہوں تیری طرف کوئی آنکھ تک نہ اٹھا سکے گا۔ میں نے تیرے سوا اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔"

اور یوں اُس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں سوائے دبی دبی آہوں اور گھٹے گھٹے دُکھی گیتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ کئی بار جب ساون کی گھٹائیں اودے پربتوں کے پیچھے سے گرجتی ہوئی اُٹھتیں۔ اور گاؤں کے کھلے مرغزاروں میں ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ جب تیز بوندیوں سے اُس کے گھر کے بوسیدہ کواڑ بجتے اور

دوشیزائیں نیموں میں جھولے ڈال کر رسیلے ملہار گاتیں تو اُس کے دل میں ایک پھول سا کھلتا جو اپنی پنکھڑیوں کو نچاتا اور اپنی خوشبو سے رانی کے ذہن باغ میں جھولوں میں جھولنے اور اونچے اونچے ملہار الاپنے کی آرزوئیں بھر دیتا تو یکایک اُس کے کانوں میں کوئی احساس سرگوشی کرتا۔ پھول کملا کر نا پید ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے دراز بالوں کی گرد آلود لٹوں کو کانوں کے پیچھے جما کر چھاج اُٹھا لیتی۔ اور اُس کی پٹخ کی دُھن پر دُکھے دبے دبے گیت گاتی!

> ہم بدقسمت روحیں دنیا بھر کے دکھوں کی امین ہیں
> ہماری آنکھوں کو مسکراتے ہوئے پھول جگمگاتے ہوئے
> تارے اور لہلہاتے ہوئے مرغزار دیکھنے کا کوئی حق نہیں
> کیونکہ ہم کملائے ہوئے شگوفوں بھیانک اندھیروں اور
> اجڑے ہوئے کھیتوں کی دنیا میں بسنے والے ہیں۔

کئی بار اُسے وہ نوجوان چرواہے بہت پیارے لگتے جو چراگاہوں میں بھیڑ بکریوں کے پیچھے ہولے ہولے قدم اٹھاتے ایسے گیت گاتے کہ اُسے انگڑائیاں آنے لگتیں لیکن اچانک اس کے دل میں یہ جذبہ ٹیس بن کر اُٹھتا کہ اُس کی روح اور جسم مرحوم شیرو کی امانت ہے۔ جسے کوئی چھو تک نہیں سکتا اور یوں وہ ٹھنڈے جھونکوں پر لدے ہوئے سُریلے گیتوں اور بنسریوں کی تانوں کو سُنکر اپنا من پرچا لیتی اور جب اُس کا باپ دن بھر جنگل میں لکڑیاں چن کر گھر آتا تو اُس کے پاؤں داب‌تی اور کہتی۔ "بابا مجھے کہیں سے ایک طوطا تو لا دو۔ یا کوئی مینا۔ یا کوئی چکور۔ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبرا جاتی ہوں ایک بلی تھی اُسے بھی جاگیردار جی کے کتے نے پھاڑ ڈالا۔ ورنہ اُسی سے جی بہلتا رہتا تھا۔"

اور بوڑھا جسے جوان دلوں کی دھڑکنوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ کہتا: "لا دونگا بچی۔ میں خود دن بھر کڑھتا رہتا ہوں کہ تو اکیلی بیٹھی کیا کرتی رہتی ہوگی۔ اِدھر پڑوس میں خدایار کے گھر چلی جایا کر۔ سُنا ہے اُس کے آنگن میں شیشم کے ساتھ جھولا پڑا ہوا ہے۔"

اور وہ اُداس لہجے میں جواب دیتی: "بابا۔ وہ بہت زور سے ہنستی ہیں۔ اور جھولے بہت اونچے چڑھاتی ہیں۔ اُن کے دوپٹے سر پر سے اُڑ جاتے ہیں، بال بکھر جاتے ہیں۔ لہنگے اور چولے ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔ مگر وہ تو یوں ناچتی گاتی رہتی ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجھ سے اتنے زور زور سے ہنسا نہیں جاتا اور بابا یہ تو تم جانتے ہو گے کہ اگر زور زور سے ہنسنے والوں میں کوئی بہت تھوڑا ہنسے، تو اُس سے سب نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک دن میں گئی تھی وہاں سب کہتی تھیں رانو پر خیرو کی موت کا سایہ ہے!"

یونہی بے بس آرزوؤں اور بے سود ارادوں میں وقت کٹتا رہا۔ کہ اچانک ایک روز رانی کے کلیجے پر چھریاں چل گئیں۔ وہ اپنے آنگن میں بیٹھی تنکوں سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا۔ جاگیردار جی کا نوجوان بیٹا اندر آیا اور اُس کے بالکل قریب ہو کر بولا: "کیا ہو رہا ہے!"

رانی کے دل پر جیسے کسی نے ہتھوڑا چلا دیا ہو جھینپ کر بولی: "یونہی بیٹھی ہوں۔"

وہ اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا: "یونہی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

اور وہ پرے کھسکتی ہوئی بولی: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ" وہ بولا "کہ تم اپنی جوانی کو یوں برباد کر رہی ہو۔ جیسے کوئی گلاب کے تازہ پھول کو گھورے پر پھینک دے۔"

رانی تن کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُسے ڈپٹ کر بولی "منہ سنبھال کر بول رے تو جاگیردار کا بیٹا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ لیکن پرائی بہو بیٹیوں سے مذاق کرنیکا تجھے کوئی حق نہیں۔ چل دور ہو یہاں سے، میں تیرے ایسے منہ پھٹ چھوکروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔"

اور نوجوان اُٹھتے ہوئے بولا "چھپکلی میرے سامنے تنتی ہے! مزا چکھاؤنگا تجھے اِس غرور کا، میں تیری ایسی کئی بی بیوں کو بیچ کر کھا چکا ہوں۔ تو تو میرے ایک داؤ کی مار ہے۔"

اور جب نوجوان چلا گیا تو رانی نے یوں محسوس کیا۔ جیسے کوئی بے شمار ننھّے ننھّے خوشرنگ پھولوں کی کیاریوں کو روند کر نکل گیا ہو، دن بھر وہ یہی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوا اور جب اُسے یہ خیال آیا کہ وہ بیوہ ہونے کے باوجود جوان ہے اُسکی آنکھوں میں مستیاں، اور لبوں میں رس ہے تو وہ گھبرا سی گئی۔ اور آنگن میں یوں کھوئی کھوئی پھرنے لگی۔ جیسے وہ کسی ایسی چٹان کی تلاش میں ہے۔ جس پر سے چھلانگ لگا کر وہ اپنے شباب کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کر دینا چاہتی ہے۔

جب بوڑھا جنگل سے واپس آیا تو ایک بار تو رانی کے جی میں آئی کہ اُسے سارا حال کہہ سنائے، مگر پھر رک گئی، کیونکہ اُس کا باپ بہت ضعیف تھا اور ذرا ذرا سی باتیں اُس پر اتنا اثر کرتی تھیں کہ اُسے رعشہ چھوٹ جاتا تھا اور بہت دیر تک دھندلی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے!

جاگیردار کا بیٹا اس کی تاک میں رہنے لگا جب وہ پنگھٹ پر جاتی تو کہیں سے ایک کنکر اڑتا ہوا آتا اور اس کی گاگر میں سوراخ کر ڈالتا۔ اس کے کپڑے بھیگ جاتے اور پنہاریاں اُس کی حالت پر بل کھا کھا کر ہنستیں اور شریر بچے شہتوت کے تنے کے پیچھے چھُپ چھُپ کر تالیاں بجاتے۔ گلی میں جا رہی ہوتی کہ اچانک اس کے سامنے دو چار ٹھیکریاں آ گرتیں اور جب وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی تو کچی دیواروں کی پرلی طرف سے اُسے دبے دبے قہقہے سنائی دیتے۔ شام کے اندھیرے میں کئی بار کسی نے اس کا دوپٹہ کھینچ لیا۔ وہ چیخنا چاہتی مگر چیخ نہ سکتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک بیوہ ہے اور اگر ایک بیوہ کا دوپٹہ اندھیری گلی میں کھینچ لیا جائے تو سب اُسی کو کوسیں گے اور پھر ان تمام حرکتوں کے پیچھے جاگیر دار کا بیٹا تھا۔ جس کی زلفیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جس کی جیبیں پھیلنے میں تھیں اور دس گائیں۔ اور جو گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش ہونے کے باوجود عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا!

بوڑھی کٹنیاں اُسے آ کر چھیڑتیں اور کہتیں "اری پھولوں سے کھیل کہ پھولوں میں حسن بھی ہے اور خوشبو بھی۔ تجھے کانٹوں میں پڑے پڑے کیا مزا ملتا ہے۔ اِدھر آ میرے ساتھ تجھے اس دوزخ سے اٹھا کر جنت میں بٹھا دوں" ——— وُہ اُن پر غصے ہوتی۔ کئی بار جلتی ہوئی لکڑیاں اٹھا کر ان کے پیچھے بھاگتی۔ کئی بار دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی اور تب تک دکھاتی جب تک اس کا بوڑھا باپ نہ آ جاتا۔ "اے رانو۔ دروازہ کھول" ——— وہ پکارتا اور رانی کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دن بھر شکنجے میں پھنسی رہی ہے، اور اب آزاد ہوئی ہے۔

کئی بار اس نے سوچا کہ بابا بہت بوڑھا ہے اور میں ابھی ستره سال کی بھی نہیں

مجھے ابھی دنیا میں بہت دنوں تک رہنا ہے، کیوں نہ اس جھنجھٹ سے چھٹکارا پا لوں اور اس امانت کو جاگیردار کے بیٹے کے ہاتھ بیچ ڈالوں۔ مگر پھر اسے خیال آتا کہ بدمعاشوں کی طرح پرائے گھروں میں جا دھمکنا اور پھر پرائی لڑکیوں کو لفنگوں کی طرح چھیڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ امیروں کے یہ من بھاتے کھیل ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ وہ ایک گیند سے کھیل کھیل کر جب تھک جائے تو ایک نئی گیند خرید لے اور یوں وہ بیشمار کچی اور پھٹی ہوئی گیندوں کے انبار تلے دب کر دم گھٹ کر مر جائے! اس لئے اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر آفت کا مقابلہ کرے گی مگر جب تک اُس کے دل میں شبیرو کی یاد ہے اور اس کا بوڑھا باپ زندہ ہے وہ کسی چھوکرے سے آنکھ تک نہیں ملائے گی۔

پچھلے چند دنوں سے اُس کا باپ بیمار رہنے لگا۔ وہ دن بھر اس کے لئے دوا دارو کا انتظام کرتی یا چھاچ پہنچاتی اور چکی پیستی رہتی اور جب چند دنوں کے بعد گھر کی پونجی ختم ہوگئی تو ایک رات دونوں اکٹھے بیٹھ کر یہ سوچتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔

نوجوان بیوہ کو اپنے پیٹ کے بجائے اپنے ضعیف باپ کے علاج کا خیال تھا۔ بہت رد و کد کے بعد اُس نے باپ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب دو تین دنوں کے وقفے کے بعد وہ خود ہی جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لایا کرے گی اور انہیں بیچ کر دوا دارو کا انتظام ہو جائے گا۔

آج اُسے لکڑیاں چننے جانا تھا۔ چھاچ وغیرہ اندر رکھ کر کھانستے ہوئے بیمار باپ سے اجازت مانگی۔

"جلد لوٹنا میری بچی" وہ بولا۔ "کیونکہ آج مجھے بخار ہے اور کھانستے کھانستے میری سانسیں رک رک جاتی ہیں۔ کالی ڈھیری کے دائیں جانب جو کھائی ہے نا اُس

میں اُتر جائیو۔ ایک گھومتی ہوئی پگڈنڈی تجھے نیچے پہنچا دے گی۔ سنبھل سنبھل کر قدم رکھیو کھائی میں تجھے بہت سی سوکھی لکڑیاں مل جائیں گی اور دیکھو اگر تو شام پڑے تک واپس نہ آئی تو فکر سے مر جاؤں گا میں۔ مجھے تو آج بار بار پیاس لگ رہی ہے اور خود کھاٹ سے اُٹھا تک نہیں جاتا۔"

رانی نے پانی کا ایک برتن بھر کر کھاٹ کے پائے سے ٹکا دیا اور کاندھے پر رسی ڈال کر جنگل کا رُخ کیا۔ دو تین بار وہ پہلے بھی اس جنگل میں آ چکی تھی اور اس کی تنہائیوں میں اس نے وہ گیت خوب جی کھول کر گائے تھے جو کنواری لڑکیاں ساون میں جھولوں پر جھولتی ہوئی الاپتی تھیں۔ خوبصورت درختوں سے باتیں کرتی رہتی۔ پست قد گنجان جھاڑیوں کو چھیڑتی۔ سفید چٹانوں پر پھسلتے ہوئے جھرنوں میں چھینٹیں اڑاتی، دیر تک ہنستی رہتی اور جب ہنستے ہنستے اور گاتے گاتے تھک جاتی تو سوچتی رہتی کہ وہ کیوں ہنسی اور کیوں گائی۔ اور پھر اچانک جاگیر دار کا بدمعاش بیٹا اس کے ذہن پر اُبھرتا اور پوچھتا "کیا کر رہی ہو؟" ——— اور اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتیں اور اس کا سارا وجود غم و غصہ کے جذبات سے دھڑکنے لگتا۔

اور آج اگرچہ اس کے دل پر باپ کی خطرناک علالت کا بوجھ تھا لیکن گنجان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، کھلی فضاؤں میں تیرتے ہوئے بے شمار پرندوں اور بہت دور کسی گاؤں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر اس کے دل نے ایک پھریری سی لی اور وہ کالی ڈھیری کے اس طرف گہری کھائی میں اُتر کر بہت دیر تک یہ گیت گاتی رہی:-

"زندہ رہا نہیں جاتا کیونکہ زندہ رہنے کا سامان موجود نہیں۔ موت قبول نہیں کی جاتی کہ جوانی کی موت بہت بھیانک ہوتی ہے۔

اے تاروں کی شمعیں جلانے والے، مجھے زندگی اور موت
کی ملتی ہوئی سرحدوں پرلے جاکر بسا دے۔ جہاں میرا دل
دھڑکنے اور دھڑکتے دھڑکتے رُک جانے کا لطف
اُٹھا سکے"!

کسی اَن پڑھ نوجوان دہقان کے یہ گیت اُسے نئی نئی دنیائیں دکھاتے رہے اور جب وہ لکڑیاں چُن چکی تو اچانک عقب سے اُسے بہت سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ جاگیردار کا بیٹا جنگل کے داروغہ کو ساتھ لئے اینڈتا چلا آرہا تھا۔ اگر وہ بلندی پر کھڑی ہوتی تو شاید نیچے چھلانگ لگا دیتی۔ لیکن یہاں نشیب میں اُسے کوئی ایسی راہ نظر نہ آئی جو اُسے ان دو بھیڑیوں کے جنگل سے آزادی دلا سکے۔

جنگل کا داروغہ اپنی مونچھوں کے دونوں سروں کو مروڑتا ہوا بولا "سرکاری جنگل کی لکڑیاں بھی چوری کرتی ہے اور زور زور سے گاتی بھی ہے۔ تاکہ ہم دس میل پر بھی کھڑے ہوں تو بھانپ جائیں کہ کوئی چور جنگل میں من مانی کر رہا ہے"۔

"میں چور نہیں ہوں" وہ خوفزدہ ہو کر بولی "میں تو خشک لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی اور سرکار نے خشک لکڑیوں کی اجازت تو دے رکھی ہے۔ دیکھ لیجئے میرے پاس کوئی کلہاڑی وِلہاڑی نہیں۔ میں چور نہیں ہوں"۔

اور جاگیردار کا بیٹا سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "تم چور ہو۔ تم نے بہت دنوں سے میرا دل چرا رکھا ہے۔ تمہیں اس چوری کی سزا ملے گی۔ تم کلہاڑی کے بجائے اپنی یہ خوبصورت آنکھیں اور یہ رس بھرے ہونٹ اور یہ لہراتے ہوئے بال استعمال کرتی ہو" —— اور نوجوان ترچھی نظر سے داروغہ کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مُسکرایا

اور بولا" کیوں جی آپ کا کیا خیال ہے؟"

رانی چیخنے لگی" مجھے بے بس دیکھ کر تم ایسی ذلیل باتیں کرتے ہو قسم خدا کی میں جھپٹ کر منہ نوچ لوں گی تمہارا!"

اور داروغہ اپنی جیب سے چند کاغذات نکالتا ہوا بولا" بہت شور نہ مچا اور یاد رکھو کہ جو لوگ میرے سامنے اونچی آواز میں بولتے ہیں میں انہیں ایسا دھکا لگاتا ہوں کہ عمر بھر انہیں کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ملتا۔ لے! نکال انگوٹھا۔ سو روپیہ جرمانہ ہوا تو تیری یہ ساری طراریاں اور شیخیاں دھری رہ جائیں گی۔"

"ادھر لا انگوٹھا" جاگیردار کا بیٹا بولا اور اُسے کلائی سے پکڑ کر کالے رنگ میں اس کا انگوٹھا بھگویا اور داروغہ کے کاغذ پر لگا دیا اور بولا" اگر تو اس جرمانہ سے بچنا چاہتی ہے جس کی وجہ سے تیرا گھر بار قُرق ہو جائے گا اور تو اپنے باپ سمیت باہر چٹانوں پر گل سڑ کر مر جائے گی۔ تو کل اسی وقت یہاں پہنچ جانا۔ سمجھیں۔ کل اسی وقت یہیں۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں!"

"کیسی باتیں؟" رانی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اور نوجوان نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا اور اس کا منہ چوم کر بولا" ایسی باتیں"

—— دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر اس نے سارا جنگل سر پہ اُٹھا لیا۔ ہونٹوں کو یوں رگڑتی رہی جیسے ان سے دو بچھو چمٹ گئے ہوں اور پیاپے ڈنک لگائے جا رہے ہوں۔ اس کے دماغ میں طوفان سے چلنے لگے اور وہ کھائی کی اونچی نیچی سطح پر یوں گھومنے لگی جیسے وہ اسے پھاڑ کر اس کے اندر سما جانا چاہتی ہے!

دوسرے روز اسی وقت جاگیردار کا بیٹا ہولے ہولے قدم اٹھاتا گھومتی

ہوئی پگڈنڈی سے اُترا اور جب آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ رانی ایک چٹان پر سر پھوڑے مری پڑی ہے۔ خشک لکڑیوں کا گٹھا پاس دھرا ہے اور کالا انگوٹھا رات کی ٹھنڈ میں یوں اکڑ گیا ہے جیسے لپک کر نوجوان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا دے گا۔

پاؤں کا کانٹا

پاؤں سے کانٹا نکالتے ہوئے ننھے کریم کی چیخ نکل گئی۔ وہ ایڑی کو دونوں ہتھیلیوں میں دباتے ہوئے پکارا "ہائے اماں!" وہ مبہوت و ساکن بیٹھ گیا اور سامنے ویران کھیتوں پر نگاہیں گاڑ دیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی آواز کا منتظر بیٹھا ہے: "میرے انمول لال! میں آئی، میں ابھی کانٹا نکالے دیتی ہوں!" —— اس کے سر پر سے ایک کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا گزرا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک جھاڑی میں جا گرا۔ کریم بھول گیا کہ اس کے پاؤں میں کانٹا ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا، کوّے کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگا، اُڑنے کی کوشش کی مگر اس کا داہنا بازو زخمی ہو چکا تھا۔ کریم نے زمین سے مٹی اٹھا کر اس کے زخم پر چھڑکی، دو چار ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں دیں۔ کوّے کو آرام پہنچا تو کھلی ہوئی چونچ بند کر لی اور

آنکھوں میں وحشت کی بجائے اطمینان جھلکنے لگا۔ کریم نے بہت سے پتے اکٹھے کر کے سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی چوٹی پر جمائے۔ کوتے کو ایک دو بار تھپک کر وہاں لٹا دیا اور گھر کو لوٹ آیا۔ اس مصروفیت میں اس کے پاؤں کے درد میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی۔

وُہ ایک زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک سال ہُوا اس کی ماں مر گئی تھی۔ اُس کے والد نے پچھلے دنوں ایک اور شادی کر لی تھی۔ لیکن اب یہ نئی ماں اس سے عجیب طرح سے پیش آتی تھی۔

"وہ برتن اندر کیوں نہیں رکھا؟"

وہ پکار اُٹھتا: "اندر ہی تو پڑا ہے!"

وہ اُس کے جبڑوں میں گھونسا جماتے ہوئے کہتی: "تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

وہ چیخ کر کہتا: "بتایا تو تھا میں نے!"

بیچارے کریم نے کئی بار محسوس کیا کہ گھونسے کے زور سے اس کا دل رُک گیا ہے۔ لیکن وہ کمبخت اچانک پھر دھڑک اُٹھتا اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے ایک اور گھونسہ سر پر منڈلاتے ہوئے دیکھتا۔ اول اول تو اس نے سوتیلی ماں کے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی: "چھوڑ دے۔ چھوڑ دے مجھے۔ ورنہ میری امّی تیری بوٹیاں نوچ لے گی، چھوڑ دے مجھے۔ ورنہ میرا ابا تجھے مار ڈالے گا۔" لیکن ایک دن جب اُس کی سوتیلی ماں نے یہ کہا کہ "تیری ماں کو تو قبر میں سانپ اور بچھو چمٹے پڑے ہوں گے، وہ تیرے باپ کا گھر تباہ کر کے اگلے جہان میں آرام سے تھوڑا رہے گی!" تو ننھا کریم غصے سے بے بس ہو کر اُس پر جھپٹا مگر دھکا کھا کر اوندھے مُنہ جا گرا۔ دوڑا

دوڑا باپ کے پاس گیا اور چیخنے لگا۔ "ابا، خالہ نے میرے دانت توڑ دیئے۔ یہ دیکھو تو مسوڑھوں سے خون بہہ رہا ہے، یہ دیکھو نا میری کہنیاں چھل گئیں، وہ کہتی ہے تیری ماں کو سانپ بچھو کھا رہے ہیں۔ وہ جھوٹ بکتی ہے ابا۔ میری ماں ہر رات آ کر میرا ماتھا چوم ......!"

تڑاخ کی آواز آئی اور پھر کریم کا کان اس کے باپ کی انگلیوں میں تھا۔ کان کو اینٹھتے ہوئے وہ بولا "خالہ کے خلاف بک رہا ہے، اب تیری ماں کا راج نہیں رہا کہ گھر کا غلّہ نکال کر دو کانداروں کے آگے جا ڈالے اور گلچھرے اڑائے۔ اب انسانوں کی طرح رہنا پڑے گا یہاں!"

اس دن کے بعد اس نے باپ کے آگے کوئی شکایت نہ کی۔ نہ اپنی خالہ کے گھونسوں کا جواب کسی دھمکی سے دیا۔ بس چپ چاپ گھونسے سہہ لیتا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پر بازو کا تکیہ بنا کر بے فکر سو جاتا۔ صبح گھونسے سہہ کر باہر جاتا۔ مویشی چرا کر لاتا اور گھونسے سہہ کر سو جاتا۔

اس دن وہ ایک بیل کے پیچھے بھاگا تو اس کی ایڑی میں کوئی بہت لمبا کانٹا چبھ گیا۔ زخمی کوے کو گھونسلے میں بٹھا کر گھر آیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پہ لیٹ گیا جو صحن کے پرلے سرے پہ بیلوں کے تھانوں کے پاس دن رات پڑی رہتی تھی۔ کھاٹ کیا تھی۔ ایک جھولا تھا۔ جس میں تھا کریم گھٹنے سینے سے لگائے، بازو جسم سے چمٹائے پڑا رہتا تھا۔

اس کی خالہ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کا باپ پاس ہی ایک پلنگ پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ اس کی خالہ کہنے لگی "ابھی تک کریم نہیں آیا، جاتے گاؤں میں

کیا کرتا رہتا ہے، پرسوں کی بات ہے ہمسائی کے ہاں گیا اور کہنے لگا: مجھے میری نئی ماں مارتی ہے، روٹی نہیں دیتی، میں بھوکا ہوں، میں ننگا ہوں۔ اب اُس سے پوچھو میں نے اسے کب مارا۔ میں نے اُسے کب کھانا نہیں دیا، کب کپڑے نہیں پہنائے۔ اس بچے کو کچھ سمجھاؤ، ورنہ یہ گھر گھر کھانے کو مانگتا پھرے گا، اور تم شریکوں کے سامنے گردن تک نہ اٹھا سکو گے:

اس تقریر کے دوران میں کریم نے ایک دوبار آواز دی۔ "میں آگیا ہوں ابّا، میں آگیا ہوں"۔ لیکن نہ اس کے باپ نے کچھ سُنا نہ اُس کی خالہ نے۔ جب وہ سانس لینے کے لیئے رُکی تو کریم ان کے قریب آیا اور بولا:۔

"میں تو کب کا بیٹھا ہوں خالہ"۔

اس کا باپ حقہ ایک طرف کر کے اس کی طرف بڑھا۔ "کیوں بے! تیری ماں کیا مری کہ تو ہر بندھن سے آزاد ہو گیا۔ گھر گھر میرے گلے ہو رہے ہیں"۔ ایک تھپّڑ کریم کے منہ پر پڑا۔ اُس کے جی میں آئی کہ باپ کے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے مگر زبان بے حس ہو کر رہ گئی۔ وہ چُپ چاپ اُٹھا اور اپنی کھاٹ کا رُخ کیا۔

"آج لنگڑا کیوں رہا ہے؟" اُس کے باپ نے پوچھا

"کانٹا چُبھ گیا تھا جی"۔ کریم نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔ آخری الفاظ کہتے ہوئے اُس کی آواز کانپ گئی!

اُس کا باپ گرجنے لگا۔ "کانٹا چُبھ گیا امیر زادے کے ——— آفت آگئی! اور لنگڑا یوں رہا ہے، جیسے کسی نے سر سے پاؤں ہی اڑا دیا ہے، اِدھر آ، سوئی لے کر دیئے کے پاس بیٹھ جا اور نکال اسے"۔

کریم اندر جا کر سوئی لے آیا، دیئے کے پاس بیٹھ کر ایڑی اٹھائی اور سوئی سے کانٹے کے ارد گرد کا گوشت کریدنے لگا۔

رہ رہ کر اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی جو اسے ہاتھوں پر اٹھائے رکھتی تھی۔ جو اس کے لئے قسم قسم کی چیزیں خرید لاتی تھی۔ کھانے کی چیزیں، کھیلنے کی چیزیں، پہننے کی چیزیں جس نے اپنی پڑوسن کو جو ایک دن کریم کے پاؤں سے کانٹا نکال رہی تھی کہا تھا " اری ذرا دھیرے دھیرے سوئی پھیر، بس یہ سمجھ تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے "!

——کریم کو یہ بات یاد آئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اُس کا باپ صحن کے پرلے سرے پر بیلوں کے آگے گھاس ڈال رہا تھا۔ اُس کی خالہ اٹھی اور اس کے پاس آکر کہنے لگی " کیوں بے لونڈے، رو کیوں رہا ہے، سانپ نے ڈس لیا ہے کیا؟"

اُس نے حسرت بھری نگاہیں اٹھائیں اور خالہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

اُس کی خالہ نے اُس کی گردن پر غصے سے اُلٹا ہاتھ مارا، کریم ڈیوٹ پر جا گرا، دیا لڑھک کر اس کی گود میں آرہا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ لہراتے ہوئے شعلوں سے چیخوں کا ایک طوفان بلند ہوا " ابا، دوڑیو، میرے ابا، میں جل مرا، ہوا ابا "!

اس کا باپ ہوا کی طرح اس کے پاس پہنچا، گھڑے پر گھڑا انڈیلنا شروع کر دیا۔ آگ بجھ گئی اور اب زمین پر کیچڑ میں لت پت بیہوش کریم آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ لالٹین جلائی گئی۔ کریم کا داہنا بازو، داہنی ران اور داہنی پسلیاں بُری طرح جل چکی تھیں، چہرہ اڑ چکا تھا۔ اور نیچے سفید چربی چمک رہی تھی۔ اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ حکیم جی نے زخموں پر مکھن ملنے کو کہا اور سب لوگ چلے گئے!

اب اس کے باپ کا دل پسیجا۔ اسے اپنی مرحوم بیوی کی مغموم روح سامنے منڈیر پہ اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں سنبھالے بیٹھی آنسو گراتی نظر آئی۔ اس کی نگاہیں اپنے جلے ہوئے بے ہوش بچے پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اُس نے تاروں کی طرف اڑتے وقت ایک سمت اشارہ کیا۔ کریم کا باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اُسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب شہر سے باہر بوڑھے نیم کی ٹیڑھی شاخوں کے گھنے سائے میں ان دونوں نے اپنے والدین کی باہمی دشمنی سے بے پروا ہو کر ہمیشہ کے لئے ایک ہونے کا عہد کیا تھا! اُس کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کا سارا جسم سو گیا۔ وہ غیر ارادی طور پہ اپنے بچے کی طرف بڑھا، جس نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور جس کی سوتیلی ماں روٹی پر گھی ڈال کر کھا رہی تھی۔ وہ کریم کے قریب گیا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا: "میرے کریم کہاں کہاں درد ہے تمہارے، تمہارے کہاں کہاں درد ہے۔ بتاؤ نا، مجھے بتاؤ کہ وہاں میں اپنے کلیجے کا خون نچوڑ دوں، بتاؤ، تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ میرے بچے تم مجھے اس طرح نہ دیکھو، میرے ننھے اس طرح تمہارے کمینے باپ کی روح میں نشتر گڑ جاتے ہیں۔ کہاں کہاں درد ہے تمہارے؟ بتاؤ نا!"

"ایڑی میں ابا!" ایک نحیف آواز آئی: "وہاں کانٹا چبھ گیا تھا۔"

کریم کا باپ کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ ابھی تک کریم کو اپنے جلنے کی خبر نہیں تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا: "ابا! یہاں ایڑی میں اتنا لمبا کانٹا چبھ گیا، خالہ، ذرا سوئی دینا، میں کانٹا نکال لوں۔"

کریم کا باپ شدتِ درد سے بلبلا اُٹھا: "ہائے میرے بچے، میرے کریم، تم تو جل گئے ہو، تمہیں معلوم نہیں کیا؟ اللہ تمہیں اچھا کر دے، بہت جلد اچھا کر دے

میں اپنے کریم کے لئے اتنی چیزیں لاؤں گا، اتنی چیزیں لاؤں گا کہ میرا کریم انہیں اُٹھا تک نہ سکے گا۔"

کریم کو اب آہستہ آہستہ اپنے جلنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کا باپ اس کی رنگت کی تبدیلی دیکھ کر ہراساں ہو گیا، پکارا۔" اری لانا ذرا، کھانڈ لانا، کریم کے منہ میں ڈالوں، یہ تو پیلا پڑ رہا ہے۔"

وہ گھی میں لقمہ بھگو کر بولی "اچھا ہو جائے گا۔ بچے جلتے ہی رہتے ہیں۔ اکثر؛ تم پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ اچھا ہو جائے گا کمبخت، تم کیوں اپنی جان ہلکان کرتے ہو، ادھر کھانا کھالو، پراٹھے ٹھنڈے ...... !"

زمیندار کے بھاری جوتے نے اُسے آگے بڑھنے کی مہلت نہ دی۔ لقمہ اُس کے منہ سے نکل کر فرش پر جا گرا۔ اس کی کھوپڑی تڑاتڑ جوتے کھانے لگی۔ اس نے سارا محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اُسے خاموش کرایا۔ زمیندار کو ضبط کرنے کی تلقین کی اور چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پہ بل کھا رہا تھا۔ گوشت کے ننھے ننھے پرزے آپ سے آپ گر رہے تھے، ساری رات اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا رہا!

صبح ہوئی تو کریم نے باپ کے گھٹنے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔" ابا تم مجھے اب مارو گے تو نہیں؟" زمیندار کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ رہے ہے۔ اُس نے انتہائی ضبط سے کہا۔" نہیں بیٹا"۔ کریم بولا۔" تو ابا ایک کام کرو، گاؤں کی پوربی چراگاہ کے اُتری کونے پر نیم کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے نا؟ سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی ٹہنی پہ ایک کوّے کا گھونسلہ ہے! اسے جا کر کچھ پانی اور دانے ڈال آؤ۔ جاؤ گے؟"

"ابھی جاتا ہوں" کریم کے باپ نے جواب دیا۔ لیکن وہ کریم کی ان بے سروپا باتوں کو بیہوشی پر محمول کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کریم نے آنکھیں کھولتے ہوئے پھر کہا "کیا نہیں جاؤ گے ابا؟"

"ابھی جاتا ہوں میرے بچے" کریم کا باپ یہ کہہ کر اٹھا۔ پانی کے لئے مٹی کا ایک چھوٹا سا پیالہ لیا۔ دانے مٹھی میں ڈال کر گاؤں مشرقی چراگاہ کی طرف گیا۔ بڑے نیم کی اونچی ٹہنی پر ایک کوا گھونسلے سے سر نکالے کائیں کائیں کر رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھا کوے کے پاس پانی رکھ دیا۔ دانے بکھیر دیئے۔ کوے کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ایک بازو بُری طرح زخمی تھا۔ وہ یہ معمہ نہ سمجھا۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ واپس ہوتے وقت ایک شخص نے اس سے پوچھا "کہاں گئے تھے آپ؟" اس نے جواب دیا "رات کو، رات کو جلا۔ بس دیئے نے کپڑوں میں آگ لگا دی اور جسم کا دایاں حصہ گل گیا!" پوچھنے والا شخص متعجب اور شرمندہ ہو کر ایک گلی میں مڑ گیا۔

کریم کا باپ اپنے بیٹے کے پاس آیا۔ جھک کر پوچھا "جاگ رہے ہو بیٹا؟"

"جاگ رہا ہوں ابا، کوے کا کیا حال ہے؟"

"اچھا تھا میرے بچے تمہیں سلام کہتا تھا۔"

کریم نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "تو میں خود جا کر اسے سلام کا جواب دوں گا ابا، اب ذرا پل کھول دو، باہر جانے کا وقت ہو گیا ہے!"

زبیدہ ارضبط نہ کر سکا، بے اختیار رونے لگا۔ اپنی نئی بیاہی ہوئی بیوی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھی اُسے بے انتہا نفرت سے گھور رہی تھی۔ اُسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب بیلوں کے لئے ایک علیحدہ ملازم ہوتا تھا اور پھر جب کریم کی ماں چل بسی، تو

ملازم کو نکال دیا گیا اور بیل کریم کے آگے لگا دیئے گئے۔ اسے اپنی ساری زندگی پر اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا دکھائی دینے لگا، وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ وقتی مسرتوں کے سیلاب میں اس کی اولیں محبت اور خاندانی غیرت کا فولادی قلعہ جڑ سے اکھڑ کر بہ گیا تھا!

وہ روزانہ صبح و شام کوے کے لئے دانہ پانی لے جاتا، کریم کے پاس بیٹھا رہتا۔ کوئی تیمار دار آتا تو اسے کہتا: "بلا ناغہ صبح حکیم جی آتے ہیں، دوا لگا جاتے ہیں، لیکن کریم کی حالت گرتی ہی جاتی ہے۔ حکیم جی کہتے ہیں کہ روزانہ کوئی اس کے زخموں کو چھیڑ دیتا ہے۔"

تیمار دار کہتا: "کروٹ بدلنے سے کچھ زخم چھل جاتے ہوں گے۔"

مگر زمیندار کی تسلی نہ ہوتی!

کریم کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی اور آخر ایک دن ایسا آیا کہ کریم صبح کو بے ہوش ہوا تو دوپہر تک اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ اس کا باپ دیوانوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بیٹھتا۔ بے مطلب، بغیر کسی کام کے، اس نے سر کو زانوؤں پر رکھا۔ پیچھے دیوار سے سہارا لے کر بیٹھنا چاہا، پاؤں پسار دیئے، گھٹنے سکیڑ لیئے، لیکن اس کے اندر غم واندوہ اور پشیمانیوں کا دوزخ دہک رہا تھا! اسے ایک لمحہ بھی سکون میسر نہ آسکا، اور اس کی بیوی مکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر انگریزی صابن سے ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتی رہی۔

دوپہر کو کریم نے آنکھیں کھولیں، حکیم جی پاس بیٹھے تھے، انہوں نے پکار کر کہا "ملک جی ادھر آئیے، بچہ ہوش میں آگیا!" کریم کا باپ دوڑا آیا، کریم کی پیشانی کو اس نے محبت سے چوما کہ اس پاس کھڑی ہوئی عورتوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی

لگ گئی۔ اُس نے پوچھا: کریم بیٹا، کیا حال ہے اب؟ طبیعت کیسی ہے؟ درد کہاں ہے؟

جواب ملا "ایڑی میں ابا! ایڑی میں درد ہے۔ ایک لمبا سا کانٹا چُبھ گیا تھا وہاں"۔

آئینہ دیکھتی ہوئی زمیندارن کانپ اٹھی۔ کریم کا باپ بولا: "بیٹا، کل تمہارا کوّا پر تول رہا تھا، مجھے ڈر ہے وہ اُڑ نہ جائے"۔

کریم بولا: "تو ابا آج آخری بار اُسے دانے ضرور ڈال آؤ"۔

حکیم جی نے کہا "اب بچے کی حالت اچھی ہے"۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کریم کے باپ نے اپنی بیوی کو کریم کی دیکھ بھال کی تاکید کی اور مٹھی میں دانے دبائے کوّے کے گھونسلے کی طرف بھاگا۔

وہ گلیوں میں بگولے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ چراگاہ میں اُس کے پاؤں ہوا میں تھرکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ باہر وگاؤں کے اتنے بڑے زمیندار کو اس ہیئت میں دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔ سورج آسمان کے سینے میں دہک رہا تھا۔ ڈھیریوں پر بھیڑیں، بکریاں اور بیل گردنیں جھکائے چر رہے تھے۔ نیم کے جھنڈ سر جھکائے کھڑے تھے ——— ساری کائنات اونگھ رہی تھی!

کریم کا باپ تیزی سے بڑے نیم پر چڑھا۔ گھونسلے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کوّا "پھر ررر" کی آواز پیدا کرتا گھونسلے سے نکلا اور چراگاہ پر سے اُڑتا، کھیتوں پر سے تیرتا، ڈھیریوں پر سے لپکتا ہُوا لرزتے ہوئے اُفق میں غائب ہو گیا۔

اُس کے حواس معطل سے ہو گئے۔ وہ ٹہنیوں سے لٹک کر نیچے آ رہا۔ پوری قوت سے گھر کی طرف بھاگا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "بیٹا کریم،

وہ کوّا تو اُڑ گیا!"

کریم کے لبوں پہ ہنسی کھیل رہی تھی جیسے وہ اپنے باپ کے جنون کا مضحکہ اُڑا رہا ہے!

حکیم جی آئے، اُنہوں نے کریم کی نبضیں ٹٹول کر کہا: "آج اس کے زخموں کو کسی نے بے حد سختی سے چھیلا ہے، اسی لئے جانبر نہ ہو سکا۔ آپ کے بعد گھر میں کون تھا ملک جی؟"

نئی بیوی کے ہاتھ سے لقمہ گر کر پانی کے برتن میں جا گرا!

کریم کا باپ کپڑے پھاڑتا ہُوا باہر نکل گیا: "لوگو! میرے بچے کی ایڑی میں کانٹا چُبھ گیا ہے، اسے نکالو، نیم کے درختوں میں ایک کوّا رہتا تھا۔ وہ آج پربت سے پرے اُڑ گیا۔ اُسے پکڑ لاؤ۔ میری بیوی نے میرے بچے کے زخم چھیل دیئے اُن پر پھاہا رکھو، ——لوگو! —— لوگو!! ——تم میرا مُنہ کیا تک رہے ہو!"

اَن بَن

جانے کیا بات ہوئی کہ میاں بیوی اُلجھ پڑے، اور اُلجھے بھی ایسے کہ دونوں ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ جس گھر میں قہقہوں کی گونج سے پڑوسیوں کو شکایت پیدا ہو چلی تھی۔ اُس پر مرگھٹ کا سا سکوت چھایا رہتا۔ اور جو کوئی بھولے سے پوچھ بیٹھتا کہ آخر اس نرالی چُپ کا مُدعا کیا ہے، تو حامد خاں لال لال آنکھیں یوں گھماتا اور جھپکاتا جیسے جھپٹ کر دبوچ لے گا اُسے! اور اگر کوئی مُنہ پھٹ بڑھیا جی کڑا کر کے سلیمہ رانی سے اس غیر معمولی سنجیدگی کی وجہ دریافت کر بیٹھتی تو وہ یوں نتھنے پھڑکاتی اور ہونٹ کاٹتی کہ بڑھیا کو کھِسک نکلنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑتا!

حامد اور سلیمہ کا جوڑا گاؤں بھر میں اپنی مثال آپ تھا۔ شادی سے قبل حامد کے متعلق مشہور تھا کہ خوبصورت اور تنومند جوان سہی۔ لیکن ایسا بد دماغ ہے کہ ہلکے ۔۔ سے

مذاق سے تڑپ اُٹھتا ہے، جو لڑکی اُس کی قسمت میں آئی اُس سے شاید ہی بن آئے۔ ہفتہ دس دن کے بعد بھاگ نکلے گی۔ اور عمر بھر حامد میاں ایڑیاں رگڑتے گزار دیں گے۔

سلیمہ کے متعلق مشہور تھا۔ کہ وہ شاید ہی گاؤں میں کسی لڑکے کو پسند کرے گی۔ اُس کے انداز میں ایسا غرور اور اُس کی چال ڈھال میں ایسا طنطنہ تھا کہ اچھے اچھے کشادہ سینوں والے جہاندیدہ گبرو بھڑک گئے اور دانتوں میں انگلی داب کر بولے۔ "اسے کون بلائے! شعلہ بن کر گرے گی۔ جاٹ سے گی بجلی کی زبان بن کر!" —— جدھر سے گزرتی ایک سکوت سا چھا جاتا۔ جہاں بیٹھتی یوں معلوم ہوتا جیسے سارے جہان کی ملکہ ہے! چنوں کی دال اور مکی کی موٹی بیلی روٹی کھانے والی سلیمہ ایسی نازک اندام تھی کہ گمان ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی پھولوں کی سیج پر سے کچی نیند میں اٹھ کر آئی ہے شادی کے دن تک اس سے کسی من چلے نے بات نہ کی۔ ایک بار ایک افواہ ضرور مشہور ہوئی کہ دلاور خاں پنگھٹ کے تنگ موڑ پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور غلیل میں کنکر رکھ کر سلیمہ کی چھلکتی ہوئی گاگر کو یوں تاک کر نشانہ بنایا کہ گول سوراخ سے پانی بہہ کر اُس کے دوپٹے، بالوں اور سینے پر سے ہوتا ہوا اس کی ایڑیوں پر پڑنے لگا۔ آس پاس پنہاریاں ایسی مغرور چھوکری کی یہ درگت دیکھ کر کھلکھلانے لگیں اور سلیمہ یوں پھنک گئی جیسے بس چلے تو نشانہ باز کو دنیا جہان کے کنکروں سے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دلاور خاں پاس ہی ایک شہتوت کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ورنہ نہ جانے سلیمہ کیا گل کھلا بیٹھتی!

حامد کا باپ فوج کا پنشنر سپاہی تھا۔ ملازمت کے زمانے میں اُس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ شہروں میں مردوں کے نام حامد اور لڑکیوں کے نام سلیمہ رکھے جاتے ہیں

چھٹی پر گھر آیا تو اپنے لڑکے رکھایا کا نام حامد اور اپنے دوست کی لڑکی جو آئی کا نام سلیمہ رکھ دیا۔ بڑے بوڑھوں نے بھنا کر کہا: "فرنگی سے دو باتیں کیا کر لیں، سارے جہان کی گردن مار آیا ہے۔ ایسے نام رکھے ہیں جیسے پخشتی خاندان ہی سے ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ جب حامد میاں کی مٹھی میں ہل کی ہتھی ہوگی اور ہونٹوں پہ ننگ ننگ! اور سلیمہ کے سر پہ چھاچھ کی ٹھلیا اور باجرے کی پانچ سیری روٹی ہوگی اور گلے میں بوری ایسے کھدر کا کمی جگہ سے مسکا ہوا چولا، تو ناموں کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی!" —— لیکن جب حامد اور سلیمہ کے ماں باپ اُنہیں اِن پیارے ناموں سے پکارتے تو اُن کے کلیجے ٹھنڈے ہوتے، حامد کا باپ ہنس ہنس کر کہتا: "ارے رکھایا بھی کیا نام ہوا۔ کیا ہم خاکروب ہیں، ہم بافندے ہیں کیا! بیس پچیس بیگھے زمین کے مالک اور نام رکھایا! —— اُونہہ!" اور سلیمہ کی ماں اپنے جھریاں پڑے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لاتے ہوئے پکارتی —— "اے سلیمہ —— اے سلیمہ رانی، اے واہ وا، کیا میٹھا نام ہے جوائی، اور بھرائی اور بھپرائی بھی کوئی نام ہیں۔ یہ تو گالیاں ہیں گالیاں —— اے سلیمہ بیٹی ادھر سرپوش میں سے میری نسوار کی ڈبیا اٹھا دے، ہے سلیمہ رانی!" —— پڑوسی بڑھیا کی یہ باتیں سُن سُن کر کڑھتے اور ادھر یہ بلند قہقہے لگاتے اور حامد کا باپ انہیں شہروں کی باتیں سُناتا۔ اس کے بعد عجیب عجیب ناموں کے تذکرے شروع ہوتے —— سکینہ رحیانت —— شمس الہدیٰ، غضنفر علی اور فرخندہ بیگم، عشرت سلطانہ، بلقیس جمال —— اور پھر ایک طرف سے سلیمہ کا ننھا بھائی کہتا —— "اور نظام حیدر آباد!" —— اور حامد کا باپ لمبے لمبے قہقہوں کے درمیان جھک جھک کر کہتا: "ارے بھولے بادشاہ نظام حیدر آباد نام نہیں، یہ تو بابا، بادشاہ کے ایک افسر کا لقب تھا!" —— اور

اس طرح ان دو غریب گھروں میں ہر وقت قہقہے مچلتے رہتے!

اور شادی کے ڈیڑھ دو مہینے بعد اچانک حامد اور سلیمہ میں کسی بات پہ جھڑپ ہو گئی اور جھڑپ بھی ایسی ہوئی کہ دم سادھ کر بیٹھ رہے۔ سلیمہ کھانا پکا کر حامد کے آگے رکھ دیتی۔ حامد کھانا کھا کر پرے ہٹ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اِدھر حامد انگلیاں چٹخاتا رہتا۔ اُدھر سلیمہ سوئی سے ناخنوں کو کریدتی رہتی اور یونہی شام ہو جاتی۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی چمگادڑ اندھیرے میں دیوار سے ٹکرا کر پھڑپھڑاتی تو وہ آنکھیں ملنے اور انگڑائیاں لینے لگتے۔ ورنہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ وہ جہاں بیٹھے ہیں سو گئے ہیں اور جہاں سوئے ہیں۔ وہیں سے صبح کو اُٹھے ہیں!

ایک روز حامد کی ماں لاٹھی ٹیکتی اُن کے گھر آئی اور آتے ہی بولی "بیٹا۔ سُنا ہے تم دونوں ایک دوسرے سے روٹھ گئے ہو، واری جاؤں اگر میں یہ جانتی کہ تم دونوں میں یوں چل جائے گی تو میں تمہیں اپنے پاس ہی سے نہ جانے دیتی۔ میں نے تو یہ مکان اس لئے تمہارے حوالے کیا تھا کہ تمہیں اپنا الگ گھر آباد کرنے کا خیال پیدا ہو۔ ابھی مجھ نگوڑی کے ذمّے تمہارے تین بھائیوں کا بیاہ ہے۔ لیکن تم ہو کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور کل تمہارا باپ گلی میں اکیلے رسی بٹتا رہا۔ کسی نے پوچھا۔ تیرے بیٹے کیا ہوئے۔ جواب دیا کہ تین کھیت پر ہیں اور حامد کچھ بیمار ہے، اور یہ کہہ کر بے چارے کے آنسو نکل آئے۔ آنسو پونچھتا رہا اور اکیلے رسی بٹتا رہا۔ بے چارہ رو رہا تھا میرے آگے کہتا تھا۔ جوان اولاد کا کوئی سُکھ نہ دیکھا۔ حامد کو کیا بیاہا۔ اپنا ایک کھلنڈرا بیٹا کھو دیا۔ سلیمہ رانی، آخر بات کیا ہوئی؟ تو تو موم کی مُورت بنی بیٹھی رہتی ہے! نئی نویلی دُلہن اللہ کرے کبھی میلی نہ پڑے۔ اے تیرا سہاگ صدیوں قائم رہے۔ تو کیوں یوں

چپ چاپ بیٹھی زمین کو گھورے جارہی ہے! اے حامد بیٹا تو ہی کچھ بتادے۔ مجھ نگوڑی بڑھیا سے اتنا کھڑا نہیں رہا جا سکتا! اے مجھ اللہ ماری کو کچھ بتادے ——!

اور حامد بھرائی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے پکارا: "بس بس ماں تم کچھ نہ پوچھو، کوئی بات نہیں ہوئی۔ یونہی طبیعت اداس ہو گئی!"

اور بڑھیا دیوار کا سہارا لیکر بولی: "تیری تو طبیعت اُداس ہوئی۔ لیکن آخر میری سلیمہ رانی کو کیا ہوا؟"

"یہ اپنی سلیمہ رانی سے ہی پوچھئے!"

"ہے سلیمہ:" بڑھیا سلیمہ کی طرف متوجہ ہوئی!

اور سلیمہ کے گال گلابی پڑ گئے۔ آنکھوں کے چاروں طرف سے چمکتے آنسوؤں کی لہریں اُبھریں اداس کی سیاہ پتلیوں کو ڈھانپ لیا۔ وہ بلکنے اور چیخنے لگی اور ڈھلکا ہُوا دوپٹہ سر پر بھونڈے انداز میں پھیلاتی، جوتے گھسیٹتی اُٹھی اور گھر سے باہر نکل گئی —— اُبھری ہوئی منڈیر پر چڑا اپنے ننھے سے سر کو طنزاً ہلاتا ہُوا بولا: "چرچر چیں چیں!" —— اور ماں بیٹا یوں دم بخود رہ گئے جیسے بیٹھے بیٹھے اچانک اُن کے سروں پر آسمان پھٹ پڑا ہے!

حامد کی ماں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی اور حامد ایک طرف مڑ کر نئی لپی پوتی ہوئی کچی دیوار میں سے بھوسے کے تنکے کریدنے لگا۔ چڑا دس بارش کے انتظار میں چھت پر جھاڑو پھیر رہی تھی۔ ماں بیٹے کو یوں اداس اداس بیٹھے دیکھا تو جھاڑو پھٹکاتی منڈیر کے پاس آگئی اور ناک پر انگلی رکھ کر بولی: "ہے نور بھری، ہے تیرے بچے جئیں —— کیوں بیٹھی دشمنوں کو رو رہی ہے!"

بڑھیا اپنی لاٹھی پر بیتابانہ انگلیاں گھماتی ہوئی بولی: "ہے بھنو، میں نصیبوں جلی اپنے لیکھ کو بیٹھی رو رہی ہوں۔ مجھ نگوڑی کے سکھ پلک مارنے میں دکھ بن جاتے ہیں۔ اتنی عمر بیتی، ابھی مجھ اللہ ماری کا جی کھول کر ہنسنے ہنسانے کا موقع ہی نہ آیا!"

"لیکن آخر بات کیا ہے"؛ پڑوسن نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا آخر؟"

اے ان میاں بیوی میں کچھ اَن بَن ہو گئی۔ سلیمہ کو تو جیسا سنتے تھے ویسا پایا۔ میں نے اس اَن بَن کی وجہ پوچھی تو بلکنے لگی۔ تسلی دینی چاہی تو جھپاک سے باہر نکل گئی۔ موئے زمانے نے کچھ ایسی پھیری لی ہے کہ ان چھوکریوں کی خفگی تو ناک کی بوند بن کر رہ گئی ہے۔ ذرا چھیڑ دو اور ٹپ سے خاک پر آ ——— اور ——— اے حامد ——— اے بیٹا تو کیوں نئی دیوار کے پیچھے پڑ گیا ہے! دیکھ یوں ناخن کے پیچھے کوئی تنکا چبھ گیا تو اور مشکل بنے گی۔ میں لے آؤں گی سلیمہ کو۔ وہ جا ہی کہاں سکتی ہے، میری بہو اور میکے بیٹھی رہے۔ میں گلیوں میں اپنے آپ پر انگلیاں اٹھتی نہیں دیکھ سکتی۔ میں اسے ابھی لینے جاتی ہوں!"

اور حامد پلٹ کر ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا: "رہنے دے ماں، جانے دے، میں تجھے ایسی چھوکری کے گھر جانا نہیں دیکھ سکتا جو میری بوڑھی ماں کا اتنا لحاظ بھی نہ کرے کہ اٹھ کر چٹائی بچھا دے۔ ہاتھ تھام لے۔ پانی بھر لائے۔ رانی کی طرح اکڑ کر بیٹھی رہی اور تو نے بات کی تو جیسے ناگن نے ڈس دیا، اچھل پڑی اور پھر بچوں کی طرح روتی ہوئی لپک کر گھر سے باہر! ——— مجھے جوان لڑکیوں کا یہ وطیرہ پسند نہیں ——— میں تیری منت کرتا ہوں، اس کے ہاں نہ جائیو۔ ویسے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اور یوں ہاتھ اٹھنے لگیں گے! ——— رہنے دے!"

اور پڑوسن جھاڑو کی تیلیاں جوڑتی ہوئی منمنائی "۔ نوج صدی نے کچھ ایسا پانسہ پلٹا ہے کہ اچھے برے کی تمیز اُٹھ گئی۔ میری لڑکی بھی پرسوں سے ساس سے روٹھ آئی ہے اور اب نیچے گھڑونچی کے سہارے بیٹھی گیلی مٹی میں لکیریں کھینچ رہی ہے!"

پڑوسن منڈیر سے ہٹ گئی تو حامد ماں کے قریب آیا اور بولا "ماں اصل میں تم عورتیں ذرا سی بات کو اتنا بڑا کر دکھاتی ہو جیسے بھونچال آگیا۔ میں تو سلیمہ کے ہاں جانے سے رہا اور تم بھی خدا کے لئے ادھر نہ جائیو۔ خود آنکلی تو اس کا گھر ہے۔ ورنہ ہم اس کے تلوے چومتے چاٹتے پھریں! ——— یہ نہ ہو سکے گا۔ میں کوئی نکما تھوڑا ہوں میں آج سے ابا کا ہاتھ بٹاؤں گا!"

لیکن دراصل سلیمہ کے روٹھنے اور پھر اُس کے یوں چل دینے سے حامد کے کلیجے پر چھریاں چل گئی تھیں۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ بہت مدت سے سلیمہ کے خیال کو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا اور چھپ چھپ کر جھاڑیوں کی آڑ میں اور منڈیروں کی اوٹ میں اُس نے کئی بار سلیمہ کو جی بھر کر دیکھا تھا۔ اُسے سلیمہ کی آن بان بہت پسند تھی۔ جب وہ کوئیں پر سے واپس آتی تو دس بارہ پنہاریوں کے آگے آگے یوں مٹک مٹک کر اور اکڑ اکڑ کر چلتی۔ جیسے کوئی شہزادی اپنی سہیلیوں اور سہیلیوں سمیت پائیں باغ میں چہل قدمی کرنے کو نکلی ہے۔ اور حامد نے جب اپنے اور سلیمہ کے رشتے کے متعلق سُنا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس روز وہ بے حد مغموم رہا۔ نہ اس کا رنگ غصے سے سُرخ ہو گیا اور وہ پریشانی میں ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھ سکتا تھا مگر یہ اُن کی بھول تھی۔ اُس کے سینے میں آنے والی خوشیوں نے کچھ ایسا طوفان مچا دیا تھا کہ اسے بہت مدت تک راتوں کو نیند نہ آئی اور دنوں کو چین نہ مل سکا اور اب

جبکہ سلیمہ اُسی کی ہوگئی تھی۔ اُس نے بہت قریب سے اُس کی گہری کالی آنکھیں لانبے ملائم بال۔ انار کی نوشگفتہ کلی کی سی رنگت اور نیم کی نودمیدہ ڈالی کی سی لچک دیکھی تھی۔ اور وہ سلیمہ کی دُھن میں یوں کھو گیا کہ اُس کا باپ اکیلا گلیوں میں رسیاں بٹتا پھرا اُس کے بھائی تن تنہا وسیع زمینوں میں ہل چلاتے رہے اور اُس کے دل میں ایک ذرا سی اُلجھن بھی نہ ہوئی۔

اور پھر وہ اپنے ہمجولیوں میں استہزا کا نشانہ بننے سے مرجانے کو کئی درجہ افضل سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ کسی کی ذرا سی کڑوی بات پر بھی ناک بھوں چڑھا لینے کا عادی تھا اور اب تو اُسے ایسی کسیلی باتیں سننے کا خوف تھا کہ اُس نے کئی بار نئی کڑاہی کے تیز کنارے سے ماتھا پھوڑ لینے کے خیال پر غور کیا!

حامد کی ماں آنسو پونچھتی ناک سُر سُراتی اور کھانستی باہر جانے لگی تو یہ کہتی گئی: "میں تیرے ابا کو بھیجتی ہوں"۔

حامد نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا باپ اُس کے ہاں آئے اور اُسے سلیمہ کو حاصل کرنے کے متعلق ہدایات دے۔ وہ ماں کے جانے سے چند لمحے بعد اپنے گھر کو مقفل کر کے ایک تنگ گلی میں سے لپک کر اپنے پرانے گھر جا نکلا۔ بڑھیا ابھی لاٹھی ٹیک کر چولھے کے قریب دُھوپ سے بیٹھی ہی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا، اور ——— !

"ارے حامد"

اور شاید اُس کی ماں نے گھر کی چار دیواری کے اندر قدم دھرتے ہی سارا حال ایک سانس میں کہہ ڈالا تھا۔ کیونکہ اندر سے ایک گرجتی آواز آئی "کہاں ہے

حامد۔ اِدھر آنا بیٹا۔ یہ تم نے کیا گل کھلائے؟"

حامد مسکراتا ہوُا ایک کھٹولے پر بیٹھ گیا اور بولا" ابّا۔ آپ کا پورا حق ہے کہ آپ اپنی اولاد کو سمجھائیں اور سیدھی راہ پر لائیں۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے دوست کی بیٹی کسی شاہنشاہ کی ملکہ ہوتی تو شاید اُس کی اپنے شوہر سے نبھ جاتی۔ یہاں اس کا پالا پڑا ہے ایک کنگلے کلموہے دہقان سے۔ وہ بہت اُونچی اُڑی ہے ابّا ـــــ وہ بھونڈے کھاٹوں اور مٹی کے برتنوں والے کچے مکان میں نہیں رہ سکتی!"

اُس کا باپ کھٹولے کے پائے پر پاؤں رکھ کر بولا" لیکن آخر اُس کا باپ کہاں کا راجہ ہے۔ یہی ایک ذراسی بیٹھک بنوالی ہے پکی اینٹوں کی۔ کیا اُسی کے بل پر سلیمہ رانی کو ہمارے گھروندے میں بسنا ناگوار گذرا! میں کہتا تھا تیری ماں سے کہ شیرنی اور ہرن کو یکجا نہ کرنا۔ ہمارا بھولا بھالا حامد ایسی چونچال چھوکری سے کیسے نبھا سکے گا۔ لیکن پکارتی رہی کہ ایسی خوبصورت اور چلبلی لڑکی کو بہو بنانا تو ایک ماں کی سب سے بڑی آرزو ہے، اب چاٹتی پھرے اُس کی خوبصورتی اور چلبلاہٹ کو اور روئے اپنے پہلونٹی کے بیٹے کے بھاگوں کو جس نے کچھ روز ہوئے تھانیدار اور ذیلدار کو بھی بھرے مجمعے میں کھری کھری سُنادی تھیں!"

اور بڑھیا چمٹے سے انگارے اکٹھے کرتی ہوئی کہنے لگی" اور جلاؤ مجھ نصیبوں جلی کے جی کو۔ مجھ اللہ ماری کو آگ میں جھونک دو۔ موئے کو مارے شاہ مدار!"

اُس روز سے حامد نے اپنے باپ اور بھائیوں کی امداد پر یوں کمر باندھ لی۔ کہ لوگ اُنگلیاں اُٹھانا بھول گئے۔ جب وہ سب تھک کر بیریوں اور نیموں کے نیچے

پتلی چھاچھ پی کر حقے کے کش لگاتے اور لیٹتے تو حامد اُسی طرح ہل چلاتا رہتا اور جب وہ شام کو چوپال پر اکھٹے ہوتے تو حامد رسیاں بٹتا۔ بھوسہ صاف کرتا۔ گھاس کترتا اور اُسے دیگر کوئی کام نہ ملتا تو اپنے پرانے کمبل کو تہ کر کے سوئے سے سیتا رہتا کہ بوڑھی گدھی کی پیٹھ ڈھانپنے کے کام آسکے!

ماں باپ نے اُسے سمجھایا بجھایا۔ لیکن وہ برابر یہی کہتا رہا کہ "مرد جب بے کار ہو تو اُسے بُری بُری باتیں سُوجھتی ہیں۔ اور میں اپنے ماں باپ کے لئے یہی بدنامی کافی سمجھتا ہوں کہ اُن کا بیٹا اپنی بیوی کو چند دنوں میں خفا کر بیٹھا۔ مجھے کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ آپ اس کا فکر نہ کیجیئے"!

اُدھر ایک روز حامد کو ایک دھوبی کی زبانی معلوم ہوا کہ سلیمہ دن بھر چکی پیستی ہے۔ بیلوں کے آگے چارہ ڈالتی ہے۔ منڈیریں لیپتی ہے اور رات کو چراغ کی روشنی میں اپنے بھائیوں کے کپڑے سیتی ہے۔ اور سُنا ہے وہ کہہ رہی تھی کہ میں کیا جانوں حامد کون ہے"؟

اور حامد چلّا کر پکارا "اور میں کیا جانوں سلیمہ کون ہے اور اُلو کے پٹھے تم کون ہو جو مجھے بے بات گلی میں روکے کھڑے ہو' بدمعاش۔ حرامزادہ"!

دھوبی بے چارا تو لپک کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں دبک گیا اور حامد بھنکارتا ہوا اپنے نئے گھر میں آیا۔ زنگ آلود قفل کھول کر فرش پر پٹخ دیا۔ شادی کا نیا پلنگ گھسیٹ کر باہر نکالا اور دھم سے گر گیا اور جب صبح کو اٹھا تو اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ نبضیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ آنکھوں میں جلن تھی اور سینے میں بھاپ کے بگولے!

اُس کے ماں باپ اور بھائی اُسے اِدھر اُدھر ڈھونڈھتے پھرے۔ اِدھر نئے گھر میں آئے تو حامد کو کراہتا دیکھ کر دھک سے اُن کے دل بیٹھ گئے اور اُن کے دماغوں میں ایسی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جیسے سرکنڈوں کے جھنڈوں میں تیز دو جھونکے گذر رہے ہوں!

حکیم جی بلائے گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ مسلسل اور بہت زیادہ محنت سے اس کے قویٰ پر بُرا اثر پڑا ہے۔ اسے کافی عرصہ تک آرام کرنا چاہیئے۔ فی الحال اسے پینے کے لئے عرق گلاب۔ اور کھانے کے لئے گلقند کی گولیاں دی جائیں۔ گلقند تو کہیں سے میسّر آگئی مگر عرق گلاب نہ مل سکا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ:۔" ہم موسمی بخار کے زمانے میں عرق گلاب خرید لاتے ہیں۔ یہ موسم بخار وخار کا تو ہے نہیں۔ حامد خاں کا تاپ کوئی انوکھا تاپ ہے!"

شام ہوئی اور آخر ایک شخص کو گاؤں سے دس میل دُور ایک قصبے میں روانہ کر دیا گیا۔ حامد کا ایک بھائی اس کے ہاں پڑ رہا۔ کچھ دیر تک دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور جب چھوٹا بھائی سو گیا تو حامد بہت دیر تک بخار کی شدت سے پریشان کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر آسمان کے اندھیرے میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاتے ہیں یا اندھیرے میں ڈُبکی لگا کر دُنیا کی دوسری طرف جا اُبھرتے ہیں۔ اور اگر یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر نابود ہو جاتے ہیں تو ابھی تک نظامِ شمسی ختم کیوں نہیں ہوا۔ روزِ اوّل سے اگر یہ ٹوٹنے اور اندھیرے میں کھو جانے کا سلسلہ جاری ہے تو ابھی تک یہ چنگاریاں چھپا کیوں رہی ہیں! —— تو کیا ٹوٹے ہوئے ستارے پھر بھی اُبھرتے ہیں ——

——اور—— پھر اُسے سلیمہ یاد آگئی اور وہ سوچنے لگا کہ اس وقت وُہ ایک گدگدے پلنگ پر پڑی مزے سے سو رہی ہوگی اور پریوں اور فرشتوں اور بہشتوں کے خواب دیکھ رہی ہوگی۔ اُسے یہ احساس تک نہ ہوگا کہ اُس کا حامد بخار کی حدّت سے تڑپ رہا ہے۔ اور عنقریب وہ ستارے کی طرح ٹوٹ کر کھو جائے گا اور دوسرے ستارے اُسی طرح چمکتے رہیں گے اور یُونہی اندھیری راتیں اور روشن دِن گذرتے جائیں گے اور کسی کو وہم تک نہ ہوگا کہ اسی آسمان پر کبھی روز ایک ستارا—— ! اور اچانک اُسے کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ دروازے کے پاس ایک پتلا سا سایہ اُس کی طرف دھیرے دھیرے کھسکتا آرہا تھا! بہت مشکل سے حامد نے اپنا خیال آلود سر اُٹھایا اور بولا" کون ہو تم ؟" لیکن سایہ آگے بڑھا اور چار کانپتی ہوئی انگلیوں کی تپتی اور بھیگی ہوئی پوریں حامد کی دھڑکتی پھڑکتی نبض پر رکھ دی گئیں ۔" تم کون ہو ؟" وہ چلّایا—— حامد کا بھائی ایک کروٹ بدل کر سو گیا ——اور یہ سایہ جھکا۔ فرش پر سے ایک گلاس اٹھا کر اُس میں کچھ چیز اُنڈیلی اور آواز آئی :" اُٹھو، یہ عرق گلاب پی لو!"

"سلیمہ!" حامد پھنکارا" تم ؟"

"ہاں، میں سلیمہ"

"تم کہاں ؟"

"سُنا ہے تمہیں عرق گلاب کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں عرق گلاب کی ایک پوری بوتل رکھی تھی!"

حامد کی نبضوں کی رفتار تیز ہو گئی اور اس کا جسم اور زیادہ تپ گیا۔ اُس نے عرق گلاب پی لیا تو سلیمہ اُس کے قریب بیٹھ گئی اور اُس کے تپتے ہوئے گالوں کو اپنی ملائم ہتھیلیوں میں دبا کر بولی "بس اتنا سا حوصلہ تھا تمہارا؟"

"اور تمہارا؟ ——— تمہارا بھی اتنا ہی حوصلہ تھا؟"

سلیمہ کا سر حامد کے بالکل قریب آ گیا۔ یہاں تک کہ حامد کی گرم سانسیں اور سلیمہ کی سرد آہیں ایک دوسرے میں اُلجھ کر رہ گئیں اور ملتہ اندھیرے جب حامد کے ماں باپ اور بھائی اس کے پاس آئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ سلیمہ بیٹھی حامد کے پاؤں دبا رہی ہے اور حامد خواب میں بڑبڑا رہا ہے ——— "کیا یہ ٹوٹے ہوئے تارے ڈوب کر پھر اُبھر آتے ہیں ——— یہ ڈوبے ہوئے تارے!"

[illegible]

[illegible] 78

[illegible]

[illegible]

قُلی

سرما کی اندھیری راتیں تھیں اور مجھے سارے شہر میں گشت کرنا پڑتی تھی۔ میں پولیس میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور ملازمت کے ان ابتدائی ایام میں میری یہ کوشش تھی کہ رات دن کی جان توڑ محنت سے افسروں کی نظروں میں وقعت حاصل کر لوں اور اپنے مستقبل کو روشن کرنے کی کوئی سبیل ابھی سے ڈھونڈ نکالوں۔ اسی لئے میں راولپنڈی ایسے گنجان شہر کی تنگ گلیوں میں بہت رات گئے تک ٹھہرا رہتا۔ مجھے بعد میں جا کر محسوس ہوا کہ بڑے افسر راتوں کو نکل کر اپنے ماتحت عملہ کی جانفشانی نہیں دیکھا کرتے۔ کیونکہ وہ شام ہوتے ہی بے شمار مصروفیتوں میں گھر جاتے ہیں —— سینما! —— شراب! —— عورت!

بہر حال روزانہ میں سارے شہر کا چکر کاٹتا اور آبادی کے آخری سرے پر ایک

بوسیدہ سے ہوٹل میں بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹہ گزارنا۔ وہاں مجھے کالے رنگ کی گرم چائے کی ایک پیالی بھی مل جاتی۔ مدھم روشنی اور دھوئیں کی وجہ سے میرے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو سکون سا محسوس ہوتا اور آس پاس بیٹھے ہوئے غریب قلیوں کی باتیں سُن کر بڑا کیف حاصل ہوتا!

اُس ہوٹل میں اکثر قلی ہی آیا کرتے تھے۔ اسٹیشن نزدیک تھا اور پھر اس ہوٹل میں ایک پیالی چائے ایک پیسے میں ملتی تھی۔ مزے سے گپیں ہانکو، ہنسو کھیلو، بنچوں پر لیٹو اور ٹین کی کرسیاں بجاؤ اور گاؤ اور جب گاڑی کی گھمان گھم سنائی دے تو بازوؤں پر پیتل کے بلّے باندھ کر بھاگ نکلو!

لوہے کی ایک کرسی جس پر کبوتروں کی خشک بیٹوں سے چھینٹ سی بچھی رہتی تھی! ——— چیل کی کمزور سی میز جو ذرا سے مَس سے چرچر بولنے لگتی تھی! ——— اور بوڑھا حقہ جس کی نال پر خدا جانے کتنی مدت کے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے! میرے منتظر ہوتے۔ میں ہوٹل کے اندر قدم دھرتے ہی یوں محسوس کرتا جیسے کسی بہت لمبے سفر کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا ہوں، دھوئیں اور دور چولہوں کے ساتھ والی دیوار سے لٹکی ہوئی پرانے فیشن کی لالٹین ——— اُنہیں دیکھ کر میرا سکڑتا ہوا دل پھیل جاتا کونے میں پرانی کرسی پر بیٹھتا کہ کھٹ سے کالی گرم چائے کی ایک پیالی میرے سامنے آ دھمکتی اور میں پشاور کے قرب وجوار کے رہنے والے تند مزاج پروپرائٹر کا شکریہ ادا کر کے قلیوں کی باتیں سُننے میں محو ہو جاتا۔

"اے فضل دین۔ یار تم تو دِلّی پار ہو آئے ہو، سُنا ہے بڑے بڑے ہوٹل ہوتے ہیں ان شہروں میں؟"

فضل دین سُرخ قمیص کی جیب سے چنے نکالتے ہوئے کہتا: "اتنے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے ہیں مَیں نے کہ سارا راولپنڈی شہر ان میں سما جائے۔ فرش پر دیکھو تو جیسے دریا پہ چل پھر رہے ہوں، کمروں میں جاؤ تو جیسے جنت ہاتھ آ گئی۔"

لمبے لمبے پائچوں کی بھونڈی سی شلوار والا ایک نوجوان کہتا: "وہاں بھی ایک پیالی چائے ایک پیسے میں ملتی ہے؟"

"نہیں بے۔ تو نے کیا انہیں بھنگڑ خانہ سمجھ رکھا ہے۔ چوّنی میں آتی ہے ایک ننھی سی پیالی۔"

"تو ہمارے کس کام کے وہ ہوٹل۔ ہمارے لئے چچا گل باز خاں کا ہوٹل ہی اچھا ہے۔"

آگرے کا رہنے والا ایک قلی پان کی پیک دیوار پر پھینکتے ہوئے بولا: "ہم نے بمبئی میں تاج محل ہوٹل دیکھا ہے۔ سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے آسمانوں پر اپنے ہاتھوں سے بناتے رہے اور کسی رات کو چپکے سے اُسے زمین پر اتار لائے اور سمندر کے کنارے نصب کر کے اڑ گئے۔"

فضل دین اپنے مدِمقابل کو دیکھ کر جل اُٹھتا اور کہتا: "اے میر صاحب، تاج محل ہوٹل نہیں، مقبرہ ہے اور بمبئی میں نہیں آگرہ میں ہے اور سمندر کے کنارے نہیں، جمنا کے کنارے ہے سمجھے۔"

میر صاحب کچھ کہنا چاہتے مگر قہقہوں کے طوفان سے تنگ آ کر چلّو بھر پیک اُگل کر رہ جاتے!

میں انہیں چھیڑنے کے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھتا: "بھئی سُرخ قمیص میں سفید بٹن! یہ کیا مذاق ہے؟"

لمبے لمبے پائنچوں کی شلوار والا نوجوان جواب دیتا" سفید بٹن سستے ہوتے ہیں۔"
"ایک آنے کے چوبیس!" (ایک طرف سے آواز آتی)
"لیکن پہلی دھلائی میں ٹوٹ جاتے ہیں کمبخت!" (ایک دل جلے پکار اٹھتے)
اس پار ایک بوڑھا قلی واعظانہ انداز میں کہتا "بھورانی سے کہو بچھڑوں پہ نہ پٹخا کرے:"
آہ بھر کر وہی صاحب کہتے "اے میری بہو تو کب کی مر چکی ہے۔ پڑوسن سے......"
"پڑوسن سے!" ـــــ سب چیخ کر پوچھتے اور کالے چہرے چیل کی کمزور میزوں پر مارے ہنسی کے جھک جاتے اکثی بار قہقہوں میں یوں گم ہو جاتے کہ بے خبری میں کوئی پیالی فرش پر جا گرتی اور پشاوری پروپرائٹر کے ہولناک نتھنوں سے اس زور کی تیز تیز سانسیں نکلتیں کہ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھرتھرانے لگتیں۔ لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہتا: "چونی کی پیالی کا ستیاناس کر دیا!"
میں سفارش کر دیتا: "ارے بھئی روز کے گاہک ہیں۔" اور پشاوری پروپرائٹر گول پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے سر پہ دباتے ہوئے کہتا: "تھانیدار صاحب کے کہنے پر چھوڑے دیتا ہوں ورنہ شلوار اتار لیتا۔"
بڑی دلچسپ محفل رہتی۔ روزانہ گشت کے بعد ہوٹل جانا میرا معمول ہو گیا اور جس روز مجھ سے ناغہ ہو جاتا طبیعت سارا دن پریشان رہتی اور دل پر ایک بے نام سا بوجھ پڑا رہتا۔
ایک روز کڑا کے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی تیز ہوا ہڈیوں سے سرسراتی ہوئی گزر جاتی۔ اندھیری گلیوں میں رینگتے ہوئے لوگ فضا میں

تیرتے ہوئے دھبے معلوم ہوتے اور دور گلی کے موڑ کی ننّی دھند میں لپٹی ہوئی یوں دکھائی دیتی جیسے مرتے ہوئے انسان کی عرق آلود زرد پیشانی! کائنات پر ہیبت سی چھا رہی تھی فراغت حاصل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رُخ کیا۔ آج کالے رنگ کی گرم چائے کی پیالی بار بار میرے سامنے آ کر منڈلاتی تھی اور میرا کپکپاتا ہوا سینہ اور شدّت سے سکڑنے لگتا تھا۔ ہوٹل میں قدم رکھا تو صرف تین قلی ایک طرف بیٹھے اونگھتے نظر آئے۔ اُن میں سے ایک انگلیوں پر کچھ حساب کر کے پھر گھٹنوں میں سر گھسیڑ دیتا اور میری کرسی کے قریب ایک اور قلی بیڑی کا کش لگا کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لہراتی ہوئی لکیر کو اوپر دھواں دھار خلا میں ضم ہوتا دیکھ رہا تھا!

قریب آ کر میں نے اُسے پہچانا۔ وہ لمبے لمبے پائچوں کی بھونڈی سی شلوار والا قلی تھا۔ اس کا نام محمد دین تھا اور وہ اٹک کے آس پاس کا رہنے والا تھا۔ مجھے اکثر اس سے باتیں کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ نوجوان پڑھا لکھا ہوتا تو یقیناً ایک ایسا زبردست شاعر ہوتا کہ قومیں اُس کے کلام کو الہام تصور کرتیں اور خاک نشینوں کی خوابیدہ روحوں میں انقلاب کے شرارے جھجھنانے لگتے۔ اُس کی باتوں میں دبی دبی آگ سی ہوتی تھی اور باتوں سے فارغ ہو کر وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ میں اسے راولپنڈی کا بہت بڑا تخیل پرست قلی سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا کہ اگر کالی داس، شیکسپیئر، ملٹن، تلسی داس، گوئٹے حافظ اور اقبال بھی محمد دین کی طرح قلی ہوتے تو انہیں کون پوچھتا۔ وہ بھی دھواں دھار ہوٹلوں میں بیٹھ کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر کو اوپر اندھیرے میں تحلیل ہوتے دیکھتے اور پیٹھ پر فولادی صندوق اٹھاتے وقت

دھیمی لَے میں گاتے ہے

عزت دی موت بھلی

بے عزتی دے جینے کولوں

عزت دی موت بھلی[1]

اور محمد دین کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو اُس کے کلام کو سنہری جلدوں میں سجا کر منقش الماریوں میں رکھا جاتا اور لوگ اُس کا نام سنتے ہی فرطِ عقیدت سے جُھک جُھک جاتے! قدرت نے انسان کو حالات کا غلام پیدا کیا ہے! یہ حقیقت مجھے محمد دین سے مل کر معلوم ہوئی۔

کُرسی کو بجتے اور میز کو چرچراتے سُن کر وہ چونکا میری طرف دیکھ کر تعظیماً اُٹھا اور بولا

"السلام علیکم تھانیدار جی!"

"وعلیکم السلام"۔ میں نے محبت سے جواب دیا۔

وہ یہ کہتا ہؤا دروازے کی طرف بھاگا "آپ کا سائیکل بھیگ نہ جائے میں اندر رکھ دوں اُسے"۔ سائیکل اُٹھا کر اندر لے آیا اور دیوار سے ٹکا کر میری طرف آنے لگا۔

"تم نے ناحق تکلیف کی، بھیگا ہؤا سائیکل ....."

اُس نے میری بات کاٹ کر کہا: "آپ تشریف تو رکھیں"۔

"آج تمہارے دوسرے ساتھی کدھر گئے؟"

---

[1] بے عزتی کی زندگی سے عزت سے مرجانا بہتر ہے۔

"گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے۔ اس موسم میں اُن کا باہر نکلنا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ نہ کمبل نہ چادر۔ ٹھٹھر کر اکڑ جائیں گے بیچارے تو بھوکی مائیں بہنیں بیویاں اور بچوں کی فوجیں کون سنبھالے گا؟ کل دُگنی محنت کریں گے، کیا کریں!"

میں نے پوچھا "تم کیوں چلے آئے؟"

"سارا دن بیٹھے بیٹھے جی اُکتا گیا ہے، ادھر آ نکلا کہ باتوں میں وقت کٹ جائے گا مگر اِدھر فضل دین بیٹھا اپنے قرض کا حساب کر رہا ہے اور ہدایت خاں وہ الگ پڑا بھوک کے مارے اُونگھ رہا ہے۔"

اچانک محمد دین کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑا ہوا اور پکارا "اے خان جی، چار پیالیوں والی چائے دانی بھر لانا۔"

چائے لائی گئی۔ اُس نے پشاوری پروپرائٹر کے ہاتھ سے چائے دانی لیکر میری میز پر رکھ دی اور بولا "پیجئے۔"

میں حیران ہو کر بولا "یہ کیوں؟"

جیب سے اکنّی نکال کر خان کی مٹھی میں دباتے ہوئے بولا "پی لیجئے۔ کیا ہرج ہے!"

جو شخص میل ڈیڑھ میل تین چار من کا بوجھ پیٹھ پر اُٹھائے ہانپتا جائے اور بدلے میں ایک اکنّی پائے اُس کے نزدیک اس اکنّی کی کیا یہی قیمت ہے کہ پولیس کے تھانیدار جی پر جن کا خیال مفلسوں کو کابوس بن کر ڈراتا رہتا ہے، نچھاور کر دے! یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا "محمد دین، آخر تم نے یہ تکلیف کیوں کی؟"

وہ ٹھوڑی کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دباتے ہوئے بولا "آپ بہت اچھے ہیں تھانیدار جی، آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں، آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

دھواں دھار کمرہ ـــــــ ٹمٹماتی ہوئی لالٹین ـــــــ کھانستا ہوا پشاوری پروپرائٹر ـــــــ اونگھتے ہوئے قلی ـــــــ گیلا فرش اور شکستہ فرنیچر! ـــــــ سارا منظر میرے سامنے جھولنے لگا۔ میری میز چرچرائی جیسے تعجب کا اظہار کر رہی ہے۔ دائیں طرف دیوار پر ایک چھپکلی چھرررر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی۔

محمد دین دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر بولا "پیجئے"۔

میں چائے پینے لگا تو وہ بولا "آپ تو انتے اچھے ہیں تھانیدار جی۔ مگر پولیس کا محکمہ اتنا بدنام کیوں ہے؟"

میں بولا۔ "اصل میں لوگ نہیں سمجھتے۔ ہم مجرموں اور بدمعاشوں کو پکڑنے والے ہیں، چمکارنے پچکارنے سے انہیں ہم قابو میں نہیں لا سکتے۔ انہیں یہ کہنا ناوافی ہے کہ "آئیے حضرت تشریف لائیے تاکہ آنجناب کو حوالات میں بند کر دیا جائے"۔ کچھ سخت کلامی کرنی پڑتی ہے، کچھ ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ پولیس والے فرعون اور نمرود کی پستیوں سے بھی نیچے لڑھک گئے ہیں۔ اصل میں دنیا نہیں سمجھتی"۔

"جی ہاں، دنیا نہیں سمجھتی"۔ محمد دین سرخ قمیص کی ایک جیب سے ایک پھٹا پرانا رومال نکال کر میرے گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ "قطرہ نہ گر پڑے چائے کا ـــــــ آپ کی وردی نہ خراب ہو جائے"۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم دن میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"میں دن کے وقت بہت تھوڑا کام کرتا ہوں۔ میری ایک بوڑھی ماں اور ایک کنواری بہن ہے۔ دن بھر ان کے پاس پڑا رہتا ہوں اور رات کو گاڑیاں دیکھتا ہوں صرف اس لئے کہ رات کو اسٹیشن پر قلیوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور رات کو مسافر ہیں

مقررہ نرخ سے کچھ زیادہ ہی دے جاتے ہیں، ساری رات کام کرتا ہوں، صبح جاکر سوتا ہوں۔ اب میری ضعیف ماں اور غمزدہ بہن دعائیں مانگ رہی ہوں گی کہ اللہ کرے میں آج کی ٹھنڈ سے محفوظ ہوں، غریب مفت میں اپنی نیند حرام کر رہی ہوں گی، انہیں کیا معلوم کہ میں گرم ہوٹل میں بیٹھا تھا نیدا جی سے باتیں کر رہا ہوں۔"

اُس کی آنکھوں میں غرور سا جھلکنے لگا اور میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا گویا وہ میرا بہت ممنون ہے۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "کے گاڑیاں دیکھتے ہو رات کو؟"

"سات آٹھ۔"

"کتنا کما لیتے ہو؟"

"آٹھ دس آنے مل جاتے ہیں اکثر۔"

"جب کسی قلی کے سامنے کوئی ایسا کمرہ رکتا ہوگا جس میں سے کوئی مسافر نہ اُترے تو وہ بہت مایوس ہوتا ہوگا۔ ہے نا؟"

وہ بولا۔ "روز کا تجربہ ہے جی۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ کسی دوسرے قلی بھائی کے بوجھ اُٹھانے میں مدد دے دی، چلو طبیعت ہلکی ہوگئی۔ یوں ہم جی ہی جی میں کڑھنے لگیں تو دوسرے ہی دن چارپائی سے لگ جائیں ـــــــ اور رات کو تو ہمیں کافی آزادی ہوتی ہے۔ دو چار کمرے دیکھ لیتے ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی اچھے پیسے والے کا اسباب اٹھائیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا: "لیکن تمہیں مسافروں کے حالات کی کیا خبر؟"

"روز کا تجربہ ہے نا جی۔ ہم مسافروں کی چال ڈھال، وضع قطع دیکھنے سے اُن کے

حالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ لیکن ایک بار مجھے بڑا دھوکا ہُوا۔ ایک سیٹھ جی کا اسباب اُٹھایا۔ جن کو میں نے قیافہ کی مدد سے بہت بڑا فراخ دل سمجھا۔ اسباب تانگے پر آکر دھرا اور ہاتھ بڑھایا تو دو پیسے ہتھیلی پر آگرے۔ مَیں نے تعجب سے پوچھا "سیٹھ جی مقرّرہ اُجرت تو ایک آنہ ہے اور پھر آپ کے صندوقوں میں تو جیسے سِکّہ بھرا ہُوا تھا"

مونچھوں پر پانچوں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولے: "کبھی پیسے کی شکل بھی دیکھی ہے تو نے ؟" ــــــ اُس روز مجھے بہت شرمندگی اُٹھانا پڑی۔ اکثر ہمارا قیافہ غلط نہیں نکلتا۔ لیکن کبھی کبھار انسان دھوکا کھا ہی جاتا ہے"

بہت دیر تک ہم اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور تاریک ہوٹل کی چھت کے سوراخ میں سے بھوار کبھی کبھار اندر بھی پڑنے لگتی تھی۔ دور پشاوری پروپرائٹر مٹی کے کشکول میں چائے پی رہا تھا اور قلی میزوں پر سر رکھے سو رہے تھے کہ اچانک محمد دین کھڑا ہو گیا۔ "گاڑی آ رہی ہے شاید۔ میں اسٹیشن جاتا ہوں۔ اجازت ہے ؟"

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "ضرور" اُس نے فضل دین اور ہدایت خاں کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تینوں سُرخ قمیصیں دروازہ کھول کر جھنجھاڑتے ہوئے طوفان کے ہولناک اندھیرے میں جذب ہو گئیں۔ میں سائیکل کو گھسیٹتا تنگ گلیوں کے غلیظ کیچڑ میں پھسلتا ہُوا رات کے دو بجے گھر آن گرا۔

لیکن اُس رات مجھے نیند بہت کم آئی۔ میں سوچتا رہا کہ اپنی جوانی کو چٹانوں تلے دبا کر کمانے والے یہ مفلس قلی کیا محبت کرنا بھی جانتے ہیں ؟ کیا ان میلی جیکٹ سُرخ

قمیصوں کے تلے بھی حساس دل دھڑکتے ہیں. پیسے پیسے کے لئے دستِ سوال دراز کرنے والے یہ پست انسان کیا ایسے ہلکے پھلکے جذبات سے عاری نہیں ہوتے کیا یہ سوکھی روٹی اور سرسوں کے ساگ سے پیٹ بھرنے والے، اندھیری کوٹھڑیوں اور متعفن محلّوں میں بسنے والے یہ ذلیل لوگ انسانیت کے درجے سے گر نہیں جاتے؟

میں تا دیر یہ باتیں سوچتا رہا کہ خودداری اور غرورِ نفس سے ان بڈیوں کے ڈھانچوں کو کیا کچھ سروکار ہوتا ہے؟ کیا ان ننگے پاؤں اور بے رونق آنکھوں والے مزدوروں کو ...... نہ جانے میں اس رات کیا سوچتا رہا!

دوسرے روز میں نے گشت کے بعد ہوٹل کا رُخ کیا تو دور ہوٹل کے دروازے پر محمد دین میرا منتظر کھڑا تھا۔ میرا سائیکل اُٹھا کر اندر دھر دیا اور میری میز کرسی کو جھاڑنے کے لئے بڑھا۔ آج میری جگہ ایک قلی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے چارا یوں اچھل کر پرے جا گرا جیسے غلطی سے شیر کے منہ پر بیٹھ گیا ہے۔

آج موسم اچھا تھا اور ہوٹل میں خوب رونق تھی۔ محمد دین اپنی کرسی اُٹھا کر میرے قریب لے آیا۔ سب قلی اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک غریب قلی پولیس کے تھانیدار کے اس قدر قریب بیٹھ جائے! یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی!

آج بھی اُس نے مجھے چائے پلانا چاہی۔ لیکن میں نے اُسے بہت منتوں کے بعد روک دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے محمد دین بولا۔ "قلی کا پیشہ بُرا نہیں۔ تجارت ہے ایک قسم کی۔ اپنی جسمانی قوت دو اور پیسے لو۔ قلیوں کے لئے جھنگا اور مسافروں کے

لئے سستا سودا ہے۔ لیکن بُرا نہیں۔ ہاں ایک بات مجھے بے حد کھٹکتی ہے۔ کبھی کبھی اسٹیشن ماسٹر مجھے اپنے گھر بلا لیتا ہے۔ میں اس کے کمرے جھاڑتا ہوں۔ بوٹ صاف کرتا ہوں۔ اُس کے پاؤں دباتا ہوں۔ وہ کہتا ہے میرا داہنا بازو قلم چلاتے چلاتے تھک گیا ہے۔ کمبخت میری پیٹھ کو نہیں دیکھتا جس پر بوجھ اٹھاتے اٹھاتے نیلی گانٹھیں پڑ گئی ہیں۔ پھر وہ اپنا ننھا بچہ میری گردن پر بٹھا دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ باغیچے میں اسے کھلاؤ ــــ قمیص اُتار کر!"

میں نے پوچھا "قمیص اتار کر؟"

"جی ہاں۔ کہتا ہے سُرخ قمیص اتار کر میرے بچے کو باغیچے میں لے جایا کرو، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ اسٹیشن ماسٹر قلیوں کو بیگار میں پکڑ لیتا ہے۔ مفت میں بدنامی ہوگی میں اُس کے ضدی بچے کو گھنٹوں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا رہتا ہوں اور جب واپس جاتا ہوں تو گھر کی بنائی جاتی ہے کہ اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے۔ یہ باتیں میرے دل میں کھٹکتی ہیں، ورنہ قلی کا پیشہ کچھ بُرا نہیں۔"

میں نے پوچھا "اُجرت ملتی ہے کچھ؟"

"جی ہاں۔"

"کیا؟"

"تیری قمیص چھین لی جائے گی۔ تیرا نمبر ضبط کر لیا جائے گا تجھے قید کرا دوں گا میں۔ تو بازار سے سودا لینے جاتا ہے تو چونّی میں سے اکنّی ضرور ہضم کر جاتا ہوگا۔ بھوکا کتّا، غلیظ چھوکرا ــــ یہ اُجرت ملتی ہے مجھے!"

میں نے کہا "یہ بھی روز کا تجربہ ہے نا!

"جی ہاں! ہے تو روز تجربہ لیکن ذرا تلخ سا تجربہ ہے، یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے ان باتوں سے۔ ورنہ یوں ہم دو دو تین تین پیسوں پر جان دینے والے جاہل لوگ ایسی باتیں کیوں محسوس کرنے لگے۔ میں ذرا نرم دل سا واقع ہُوا ہوں۔ ایسی باتیں مجھے بہت چبھتی ہیں۔ آپ کل ہی کی سنئے۔ میں بارش کے طوفان میں ٹھٹھرتا ہُوا گاڑی کے وقت پر پہنچا اور ایک مسافر نے مجھے اشارہ بھی کیا۔ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک بابو مجھے بازو سے پکڑ کر دفتر میں لے گیا اور میرے سر پر پھلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا رکھ کر بولا "میرے کوارٹر میں رکھ آؤ اسے —— جلدی —— ایک منٹ میں —— راستے میں پھلوں کو چھیڑنا نہیں"۔

میں اگر انکار کرتا تو میری قمیص اور نمبر ضبط کر لئے جاتے۔ اُس مسافر کو ایک اور قلی مل گیا۔ مجھے اس بات سے مسرت ضرور ہوئی کہ میرے ایک اور بھائی کا تو صبح کا کھانا بن گیا۔ مگر گھر آ کر ماں بہن کا فاقہ دیکھ کر بہت دیر تک رویا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ جگہ جگہ سے چھت ٹپکنے لگی۔ کھپریل کا چھپر ایسی موسلا دھار بارش کو کیا خاک روکتا۔ جھک گیا ہم کھسکتے کھسکتے ایک کونے میں آ گئے۔ اس حالت میں کہ میرا سر ماں کی گود میں تھا اور میرا بازو بہن کے گھٹنوں پہ —— اور تھا ئیدا بجی، اچانک میری گردن اور میرے بازو پر چار گرم گرم قطرے آن گرے۔ میں جانتا ہوں وہ بارش کا پانی نہ تھا۔ آنسو تھے۔ پڑوس میں ایک ماسٹر جی رہتے ہیں، خیال آیا کہ اُن سے روٹی کا ٹکڑا مانگ لاؤں مگر...... گاڑی آ رہی ہے، اجازت ہے مجھے"؟

وہ اُٹھا، سُرخ قمیص بجلی کی طرح دروازے سے باہر نکل گئیں اور اندھیرے کمرے میں پشاوری پروپرائٹر کے سرحدی حقے کی گُڑ گُڑ گُڑ اور میرے دل کی دھم دھم دھم

سے قطع نظر مکمل سکوت طاری ہوگیا۔

اس کے بعد چار دن تک مجھے محمد دین نظر نہ آیا۔ قلیوں سے پوچھا۔ مگر انہیں اس کے سوا کچھ خبر نہ تھی کہ وہ اب اسٹیشن پر نہیں آتا۔ شاید منڈی میں مزدوری کر رہا ہے۔

پانچویں دن میں ذرا دیر سے ہوٹل میں پہنچا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا اور وہ بہت بے تابی سے ہوٹل کے سامنے سڑک پر چل پھر رہا تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ میرا سائیکل اٹھا کر اندر دیوار سے لگا دیا۔ میری میز کرسی کو جھاڑا اور بولا "خیریت رہی تھانیدار جی!"

میں نے کہا: "تم سناؤ۔ اتنے دن کہاں رہے؟"

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا "بہن کو نمونیہ ہو گیا تھا۔"

"پھر؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا

"آج چل بسی"۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں، ہونٹ کانپ گئے۔ حلق گھٹ گیا۔

"بہت افسوس ہوا مجھے۔ مجھے بہت ہمدردی ہے تم سے۔ اس کے دوا دارو کے لئے پیسے کہاں سے لاتے رہے؟"

"کہیں سے نہیں جی۔ مجھے اس کی تیمارداری سے فرصت ہی کہاں تھی کہ اسٹیشن کے چکر لگاتا۔ ماں بہت بوڑھی ہے اور بہن بیچاری بہت کمزور تھی۔ فاقوں نے اور نڈھال کر دیا تھا۔ تین دن کراہتی رہی۔ آج ختم ہو گئی۔ ماں الگ بیمار پڑی ہے —— مجھے کسی سے کچھ مانگتے شرم آتی ہے تھانیدار جی۔ عمر بھر اپنا پسینہ بہا کر کماتا رہا اور کھاتا رہا۔ اب بغیر کوئی کام کئے کسی سے کچھ مانگتے شرم آتی ہے میں ذرا نرم دل

واقع ہُوا ہوں۔ دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے ان باتوں سے۔ مانگنے کی جُرأت نہیں ہوتی۔ آج اُس کے مرنے کے بعد بازار میں مزدوری کرتا رہا۔ اُس کے کفن دفن کی کچھ تدبیر کی۔ اب......"

میں نے بات کاٹ کر کہا: "مگر محمد دین، دوسروں کو چھوڑو۔ تم نے مجھ سے کیوں نہ مانگا؟"

"مجھے کسی سے مانگتے شرم آتی ہے تھانیدار جی ——" وہ رُک گیا۔ ذرا وقفے کے بعد پکارا: "اے خان جی! چار پیالیوں والی چائے وانی دے جانا۔"

"کیوں؟ کس لئے؟" میں نے پوچھا

اُس نے اکنی جیب سے نکالی اور پشاوری پروپرائٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "پیجئے، پی لیجئے۔ کیا ہرج ہے تھانیدار جی —— گاڑی آ رہی ہے شاید۔ اجازت ہے مجھے؟" اور وہ بے شمار سُرخ قمیصوں کے ریلے میں دروازے سے نکل کر اندھیری رات میں گم ہو گیا۔

میری میز چرچرائی اور دائیں طرف دیوار پر ایک چھپکلی چھر ر ر ر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی! میرے سامنے چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی! ٭

السلام علیکم

گاؤں میں چھٹی لکھ دیتا تو اسٹیشن پر کوئی ٹٹو، خچر یا گدھا ضرور موجود ہوتا لیکن اوّل تو اُسے خط لکھنے کا وقت ہی نہ ملا۔ دوسرے وہ اپنے بیوی اور بچّے کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیران کرنا چاہتا تھا جب وہ گاڑی سے اُترا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں سے ڈھکی ہوئی گول گول ڈھیریاں اُس نے چاروں طرف بکھری ہوئی دیکھیں تو اُس کے کلیجے پر جیسے کسی نے برف سے زیادہ ٹھنڈی انگلی رکھ دی!

تین سال اُس نے فرانس میسوپوٹیمیا اور مصر میں گذارے تھے تین سال وہ مورچوں کے دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا کیچڑ سے بھری ہوئی خندقوں میں منہ کے بل لیٹا رہا۔ خاردار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا دبکا رہا۔ جب گولیاں شوکتی ہوئی اسکے سر پر موت کی مہین لکیریں کھینچتی گذر جاتیں۔ اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں

کے دہانوں کے عین پہلو میں آ کر پھٹتے تو وہ دھوئیں اور دھول سے اٹی ہوئی فضا میں اپنی بے رونق آنکھیں جھپکاتا ہوا رہ جاتا جب ہوائی جہازوں کی پُراسرار بھنبھناہٹ سنکر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور بم کے گولے ایک تیز "وہ وہ وہ" کے ساتھ گرتے۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی اور دھندلی فضا میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور بانہیں، کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے نظر آتے تو اس کی ذہنی نظریں اپنے وطن کی پست قد پہاڑیوں پر جم جاتیں اور پھر اُن کے درمیان زرخیز وادیوں کے کناروں پر پہاڑوں کے دامنوں میں ننھے ننھے گاؤں —— اور ان گاؤں کے بھولے بھالے باشندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں —— کبڈی کے میلے اور بلوے کی تیاریاں —— اس کی خوبصورت بیوی اور اس کا بھدا بچہ —— یہ سب چیزیں رائی کے مرچیں لگا دینے والے پلستر کی طرح اس کے حافظے پر چمٹ جاتیں اور بندوق میں کارتوس ڈالتے —— دستی بم پھینکتے یا لوہے کے خاردار تاروں پر لکڑی کے تختے یا گلی سڑی لاشیں رکھ کر پھلانگتے ہوئے یہ احساس ہر وقت اس کی ڈھارس بندھائے رکھتا کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں —— بے یار و مددگار نہیں۔ اس کا اپنا وطن ہے۔ اپنا گاؤں ہے۔ اپنا گھر ہے۔ اسکی اپنی بیوی اور اپنا بچہ ہے۔ اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے والی اور اس کی موت پر مدتوں تک سوگ منانے والی دو ہستیاں ایک پُرامن اور پُرسکون جھونپڑی میں موجود ہیں۔

محاذ سے لوٹتے وقت جب وہ کسی زخمی کو لاشوں کے انبار کے نیچے کراہتا دیکھتا یا چند دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضا پر اس کی نظریں پڑتیں تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھ دیا ہے اور لاش سے کچا بدبو والا غلیظ لعاب رسنے لگا ہے یہ محسوس

کرتے ہی وہ کانپ جاتا جیسے بے شمار بموں کے دھماکے سُن کر اُس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں اور اُس کی چکراتی ہوئی کھوپڑی خاک اور خون کے غیر محسوس ذرّے بن کر خلا میں کھو گئی ہے!

امید وبیم کے ان الجھیڑوں سے نکل کر وہ گھر آ رہا تھا۔ لیکن ایک احساس رہ رہ کر اسے ستا تا تھا۔ اُس کی روح کے ایک کچّے زخم پر سے بار بار پھاہا اُتر جاتا تھا۔ قدم قدم پر وہ واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے تیر جاتا۔ جب اُسے فرانس کے ایک گاؤں میں لیوسی ملی تھی۔ لیوسی نے اُسے دو چار دن ذرا غور سے دیکھا تھا۔ اور ایک روز گلی کے موڑ پر ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اس نے لیوسی کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ اُسی رات وہ بارک سے کھسک کر لیوسی کے گھر کے قریب پہنچا۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکالے اسکی راہ دیکھ رہی تھی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کے پاس آیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے لیکر ماتھے کی آخری ہلکی تک سنگِ مرمر میں ڈھلی ہوئی حسن و نزاکت کی پتلی لیوسی —— بڑی بڑی نیلی آنکھیں مٹکاتی —— لمبی لمبی خمیدہ پلکیں جھپکاتی —— سنہرے ملائم بال نیلی مہین رگوں کے جال میں لفپتے ہوئے سُرخ و سپید گالوں پر بکھیرتی اور مرمریں گردن میں ایک مبہم سا خم ڈالتی اُس کی طرف بڑھی اور اپنی گوری گوری بھری بھری باہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیں۔ اپنے لب اس کے لبوں پر کچھ ایسے انداز سے رکھے کہ اُس کا دل پسلیوں سے ہُمک کر اُس کے حلق میں اٹک گیا اور صبح کو اسے لیوسی نے جگا کر کہا "جاؤ جاؤ، دن چڑھ آیا ہے۔ بگل کب کا بج چکا ہے، جاؤ!"

اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ لیوسی کے پاس بلا ناغہ آتا رہا اور جب سال کے بعد ہندوستانی فوجیں پھر اسی گاؤں میں واپس آئیں تو وہ لیوسی کی تلاش میں سارے

گاؤں اور گاؤں سے باہر چراگاہوں کی خاک چھانتا پھرا اور آخر اسے ایک بڑھیا کی زبانی یہ سُن کر بیحد افسوس ہوا کہ "مس" لیوسی اپنا تین ماہ کا بچہ لیکر پیرس چلی گئی ہے اور وہاں اتحادی فوجوں کے لئے صابن بنانے والے کارخانے میں کام کرتی ہے۔!

لیوسی کا خیال آتے ہی اس کا دل ایک لمحے کے لئے سکڑ جاتا لیکن یہ خیال کر کے اسے تسلی ہو جاتی کہ اس راز کو لیوسی اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا!

اور اب وہ تین سال زندگی اور موت کے کڑے امتحانوں سے گذر کر دو مہینے کی چھٹی پر گھر واپس آرہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اُسے گذشتہ تین برس کی تنخواہ مل گئی تھی۔ اور چھ سو روپے بمشت حاصل کر کے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے انگریزوں نے اپنے سارے خزانوں کی تھیلیاں اس کی جھولی میں اُلٹ دی ہیں!

اسٹیشن پر اتر کر اس نے سنتروں اور کیلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا خریدا۔ ریوڑیوں اور جلیبیوں کی ایک گٹھڑی باندھ لی۔ ایک نیا صندوق خریدا جس پر سبز پھولوں اور سرخ طوطوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بیوی کے لئے ایک ایسا دوپٹہ خریدا جسے آٹھ بار بھی کسی چیز پر تہ کر کے رکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے۔ اپنے بچے کے لئے ایک قلم خریدا جس کے دوسرے سرے پر ایک پنسل اور پنسل کی دم میں ربڑ کا ننھا سا ٹکڑا جڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی نے ننھے کو سکول بھیجنا شروع کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتی تھی "میرا ننھا بد شکل ہے تو کیا ہوا ——— یہ تو بڑا ہو کر منشی بنے گا اور منشی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں!"

بیوی کے لئے ستارے والی جوتی اور منّے کے لئے سفید پھندنے والی سرخ ٹوپی خرید لی ——— اُس نے سوچا کہ تین سال بعد اُس کی بیوی اور منّا خدا جانے کن

کن نعمتوں کے امید وار بیٹھے ہونگے!

بستر وہیں اسٹیشن پر اپنے ہی گاؤں کے ایک قلی کے پاس رکھ کر اُس نے پھلوں کے ٹوکرے صندوق اور مٹھائی کی گھٹڑی کو کچھ اِس سلیقے سے باندھا کہ سر پر اٹھاتے ہوئے اُسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور تارے آہستہ آہستہ آسمان کی گہری نیلی تہوں کے نیچے سے اُبھر رہے تھے۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اس لئے کوئی روشنی کی اُمید نہ تھی اُسے اپنے علاقے کی ننھی ننھی پگڈنڈیوں کے جال اپنے ذہن پر چاند کی کرنوں کی طرح اُبھرتے محسوس ہوئے اور وہ بے فکر چلتا گیا۔ لیکن شاید دہقانوں نے پگڈنڈیوں کے رُخ بدل ڈالے تھے۔ کئی بار وہ کیاریوں میں گھس گیا۔ جو کنوئیں کے پانی سے لبریز تھیں کئی مرتبہ گیہوں کے کھیت اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ کئی بار گول گول تھروں کی حد بندیوں سے اُس نے ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن اُسے اپنے بھٹک جانے میں بھی کیف سا محسوس ہوا۔ گیہوں کے بھیگے ہوئے پودوں کو چھو کر اُسے اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے جب درانتی سے گھاس کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھوں پر سبز رنگ چڑھ جاتا تھا اور جب وہ گھاس کے گٹھے اٹھانے میں اوّل درجہ کا قوی نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ گول گول پتھر جب اُس کے ٹخنوں سے ٹکرا کر بجتے تو اسے اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آجاتیں۔ جب گائے بکریوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس کی پنڈلیاں دُکھنے لگتی تھیں اور کنکر اڑ اڑ کر اُس کی ایڑیوں اور ٹخنوں کو زخمی کر دیتے تھے۔ اور جب تھک کر وہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں سوکھی لکڑیاں جلا کر وہ ایسے ایسے دوہے گاتا۔ جن کا مطلب خود اُسے معلوم نہ ہوتا تھا! ـــــــ ان تصورات کے جلو میں

بیوی کا نازک پیکر تیز جھونکے کی طرح آتا اور اسے لمحہ بھر کے لئے جھنجھوڑ کر چلا جاتا!

جب وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہنچا تو اسے صرف ایک جگہ اندھی سی روشنی دکھائی دی، اور وہ جی ہی جی میں کڑھنے لگا کہ اس کی بیوی کو کس کم بخت نے اطلاع دیدی کہ وہ جنگ پر سے واپس آرہا ہے! اس نے بہت بڑی گٹھڑی کو ایک تھکے ماندے شانے سے دوسرے تازہ دم شانے پر منتقل کرتے ہوئے جی میں کہا۔ سارا مزا کرکرا ہوگیا" ساری لذت ملیا میٹ ہوگئی!" ــــ اس کی آدھی خوشیوں پر بچوں کے ان نیلے پیلے غباروں کی سی جھریاں پڑ گئیں جن میں سے تھوڑی سی ہوا نکل گئی ہو!

جب اس نے اپنے گاؤں کی پہلی گلی میں قدم دھرا تو ایک گول سا پتھر ڈھلان سے لڑھکتا ٹخ پخ بجتا کھائی میں گر گیا اور پتھر کا شور سن کر قریب ہی ایک کتا تڑپ کر اٹھا اور اس زور سے بھونکا کہ سوتے ہوئے پہاڑ جاگ اٹھے اور گاؤں کے مشرق سے مغرب تک سے ننھے بچوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک سب کتے بلبلا اٹھے تو اس نے سمجھا کہ اس کا راز فاش ہوگیا ہے اور جیسے مکانوں کی منڈیریں اس کی طرف سر ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں "ہوں چھپ چھپ کر آتے ہو؟ ــــ ہم سب کچھ جانتی ہیں ــــ تم امیر خاں سپاہی ہو! ــــ تم سنہ چودہ کی لام سے واپس آرہے ہو۔ تمہاری بیوی نے تمہارے لئے سویاں پکا رکھی ہیں تمہارا بچہ تمہارا حقہ تازہ کر رہا ہے۔ تمہارے خاندان کی عورتیں چھتوں پر ۔۔ ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ تم ہم سے چھپتے ہو؟ ــــ ہوں"

دیواروں سے لگ کر چلتا تیز تیز قدم اٹھاتا جب وہ مسجد کے قریب سے

گذرا تو اسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے اور مولوی جی جو اس قبت نماز پڑھا رہے تھے، بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، دیئے کی پیلی روشنی ان کی سفید براق داڑھی پر پڑ رہی تھی اور جب انہوں نے اللہ اکبر کہا تو اُس نے محسوس کیا کہ ان کی تیلسی بھی جھڑ چکی ہے اور اُن کی سریلی آواز پرانی سارنگی کی اُس بے ہنگم تان میں تبدیل ہو چکی ہے جو اس کے آخری ڈھیلے ڈھالے تار سے بیخبری میں نکل گئی ہو!

مسجد کا دیا دیکھ کر اُس کی خوشیاں پھر نئی شان سے اُبھریں۔ اُن نیلے پیلے غباروں میں پھر کسی نے ہوا بھر دی۔ اُس کا گھر مسجد کے قریب ہی تو تھا، ایک میل دور سے اگر اُسے مسجد کا دھوکا ہوا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اندھیرے میں نظریں بھٹک ہی جاتی ہیں اور پھر تین سال کا پھیر ہے۔ تین دنوں کا تو نہیں کہ قیاس حرف بحرف پر سچ نکلے!

وہ اپنے گھر کے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا کہ ایک شخص اُس کے قریب سے "السلام علیکم" کہہ کر گذر گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ سلام کا جواب دینے میں چالیس دنوں کی نماز کا ثواب ہے لیکن وہ صرف اِس لئے خاموش رہا کہ اُسے اپنے راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا جس جذبے کو اپنے سینے میں چھپا کر وہ میسوپوٹیما سے روانہ ہوا تھا اُسے ذرا سی آواز نکال کر وہ خاک میں کیونکر ملا دیتا۔

اُس نے اپنے مکان کا دروازہ بے حد احتیاط سے کھولا خشک لکڑی کا مَس بجلی کی طرح اُس کے قلب کی طرف دوڑا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا! گٹھڑی سر سے اتار کر وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے لپٹ گیا ——— اس کا پرانا دوست ——— مدتوں کا خاموش ساتھی ——— جس کی آڑ لے کر اُس نے شادی سے قبل گاؤں کی ہر لڑکی کو جی بھر کر دیکھا تھا اور جس کے پیچھے چھپ کر اُس نے اپنی بیوی پر چھاچھ کی گلی

کر دی تھی گٹھڑی ہاتھ میں لٹکا کر اُس نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھا مکان کے صحن میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ چارپائیوں کے قریب گیا۔ ایک خالی تھی اور دوسری پر اُس کا بچہ سو رہا تھا۔ ایک بار اُس نے سارے صحن کا چکر کاٹا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی بیوی کہیں پڑوس میں ہے تو وہ بڑھ کر اپنے بچے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا "میرے بچے، میرے منے!" وفورِ مسرت سے اُس کا گلا گھٹ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آسمان پر ننھے تارے اُس کی خوشیوں سے متاثر ہو کر کروٹیں سی بدلنے لگے اور پڑوس میں کوئی بوڑھی بکری اپنی پھٹی پھٹی آواز میں یوں ممیائی جیسے پکار رہی ہے: "امیر خاں —— ہو امیر خاں!"

مسکرا کر اُس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالی۔ دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے اُس کا لڑکا بے شمار صورتیں اختیار کر کے اُس کے تصور پر منڈلانے لگا —— تین سال اور چھ سال کی عمر میں بچے کی شکل و صورت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کے دماغ کی سلوٹوں میں رینگنے لگیں۔ اور جب دیا سلائی کی رگڑ سے چھر رر کی آواز پیدا ہوئی تو جیسے اُس کے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا —— گٹھا گٹھا چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ، ٹیکے ہوئے گال، چوڑی ناک، تنگ ماتھا، ذرا سی گردن —— "میرا بچہ!" —— اُس نے سرگوشی کی اور جب وہ اُسے چومنے کے لئے اتنی بے شمار پیاری چیزوں میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرنے لگا تو بچے کے دائیں گال پر ناک سے لیکر کان تک اُسے ایک سانولی سی لکیر نظر آئی۔ دیا سلائی بجھ گئی اور اُسے وہ دن یاد آ گیا جب اُس کی بیوی بیمار تھی اور وہ خود چھری لیکر شلغم چھیلنے لگا۔ اُس کی بیوی یہ برداشت نہ کر سکی کھاٹ سے اُتر کر چھری اُس کے ہاتھ سے چھیننا چاہی تو پاس ہی منا بیٹھا تھا۔ اُس کے

گال پر جا لگی اور خون کی ایک تیز دھار اس کے گلے سے ہوتی ہوئی اُس کے اُبھرے ہوئے پیٹ پھولی ہوئی رانوں اور گھٹی ہوئی پنڈلیوں سے گزرتی۔ ایڑی پر پڑنے لگی تھی۔ اسکی بیوی نے دس سیر سوجی کے حلوے کی منت مانی تھی اور جب ننھا اچھا ہو گیا تو اُس نے دس سیر سوجی کا حلوا پکانے کے لئے نمبردار کے گھر سے بڑا دیگچہ منگوایا۔ اور جب فقیر سائیں کی خانقاہ پر جانے کے لئے اس نے میراثن کو بلوایا اور دیگچہ اُس کے سر پر دھرا تو وہ مسخری دو ایک بار لڑکھڑائی اور چلا اُٹھی "ہائیں، مجھ نگوڑی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سوجی کا حلوا بھی کمر توڑ ڈالتا ہے"۔

اب اُس نے جھک کر اُسی سانولی لکیر پر اپنے خشک ہونٹ رکھ دیئے اور بچے نے نیند میں انگڑائی لیتے ہوئے اُس کے منہ پر ایک ننھا سا طمانچہ لگا دیا ——— قہقہہ ضبط کرنے کے لئے اُس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ دیا۔ اُٹھ کر سرکنڈے کے چھپر تلے آ گیا جہاں گٹھڑی پڑی تھی۔ صندوق کا کنڈا کھول کر مہین دوپٹے ——— سلمے ستارے والی جوتی، اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو چھوا ——— پھلوں کا ٹوکرا اُٹھا کر ایک طرف رکھا مٹھائی کی گٹھڑی صندوق پر دھر دی۔ روپوں کی پوٹلی پر ایسے ہی ہاتھ پھیرا اور یوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ نئی دُنیا سے اِس پرانی دُنیا میں ایسی ایسی چیزیں لے کر آیا ہے جن کا آج تک گاؤں والوں میں سے کسی نے نام تک نہیں سنا۔!

صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اُس کے کان دل کی دھک دھک سننے لگے۔ اور پھر یہ دھمک صحن میں گھومنے لگی ——— اوپر فضا میں اُٹھ گئی ——— کائنات میں پھیل گئی ——— اندھیرے سے چھن کر ستاروں میں سما گئی ——— زمین و آسمان اُس کے دل کی دھڑکن

کی تال پر ناچنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ جیسے اُس کا کوئی بہت بڑا راز فاش ہونے والا ہے!

اچانک بھینچا ہوا دروازہ چرّ خ سے کھلا اور اُس کی بیوی صحن میں داخل ہوئی اُس کے دل کی دھک دھک اچانک رُک گئی۔ جیسے گاڑی کا انجن جنگلوں اور پہاڑوں میں دندناتا ہوا یکایک تھم گیا ہے ——! ایک قلابازی کھا کر کوئی چیز اُس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں بیٹھ گیا۔ اُس کا دماغ تپنے لگا! اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے! —— رونگٹے اُس کے جسم پر چیونٹیوں کی طرح سرسرانے لگے۔ اُس نے اپنی انگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی مگر اسے کوئی درد محسوس نہ ہوا۔ جیسے وہ کسی لکڑی کو چبا رہا ہے!

اُس کی بیوی نے دیوار کے اندر پڑا ہوا دیا روشن کیا اور ایک لمحے کیلئے امیر خاں کو ایسا محسوس ہوا کہ بیتے ہوئے دن اور تمام گھڑیاں دیے کی لَو میں ٹمٹمانے لگی ہیں —— لیوسی کی آنکھوں کی چمک بھی اس لرزتی ہوئی لَو میں جھلک رہی تھی!

تین برس —— جن کے خدا جانے کتنے دن ہوتے ہیں، اپنے تمام موسموں سمیت، اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان کھڑے ہو گئے —— تین برس! —— اسے معلوم نہ تھا کہ ایک ایک برس اتنی موٹی دیوار چن سکتا ہے!

امیر خاں نے اِن تین برسوں میں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا —— ہائیں! یہ کیا! —— امیر خاں کا ہاتھ اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا! —— اس کی بیوی کے انگ پر ریشمی قمیص تھی اور دوپٹہ —— دوپٹہ! —— اُس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا —— اس کی بیوی کے مہین دوپٹے میں سے اس کے بالوں کی سیاہی باہر

نکل رہی تھی ۔ امیر خاں کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ بیری کے پتے گھوٹ گھوٹ کر بالوں میں لگایا کرتی تھی ۔ اور اُس سے کہا کرتی تھی "میرے بال اتنے لمبے ہو جائیں گے اتنے لمبے ہو جائیں گے کہ بس تم دیکھا ہی کرو گے !" —— اور اب امیر خاں ان بالوں کو دیکھتا ہی رہ گیا ۔ کیونکہ اس کے بال بہت لمبے تھے اور جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھی ۔ اُس کو بھی آٹھ بارتہ کر کے کسی چیز پہ رکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے !

چرچراہٹ ہوئی اور امیر خاں کی آنکھیں جو ابھی تک تین برسوں کے اندر برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں ، اپنی بیوی کے پاؤں پر پڑیں —— اُس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف اُٹھ گیا —— سلمے ستارے کی جوتی اُس کے پاؤں میں تھی اور —— دیئے کے اُس طرف ایک کھونٹی کے ساتھ ایک سفید پھندنے والی سُرخ ٹوپی لٹک رہی تھی —— وہ آنکھیں میچ کر جھک گیا اور ہاتھ فرش پر ٹیک دیئے —— کوئی چیز اُس کی اُنگلیوں سے مَس ہوئی ! یہ سنترے یا کیلے کا ایک چھلکا تھا ۔ اُس نے وہ سوکھا ہوا چھلکا اٹھا کر یوں پھینک دیا جیسے قصائی گوشت پر سے چھیچھڑا آتار کر اڑا دیتا ہے ! چھلکا اندھیرے میں مٹی کے کسی برتن سے ٹکرایا —— آہٹ ہوئی ! —— اس کی بیوی ایک دم چونکی ! امیر خاں نے جو کہ ابھی اس چھلکے کی گرفت انگلیوں میں محسوس کر رہا تھا ، جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپوں کی پوٹلی کو چھوا —— اس کی بیوی آہٹ کی جستجو میں بڑھی —— سمٹی ! —— اس کے شیشے ایسے دوپٹے کا ایک کونہ جس میں کچھ بندھا تھا پھسل کر نیچے گرا —— ہلکی سی چھنن کی آواز آئی —— امیر خاں نے جیب میں اپنے روپوں کی پوٹلی پر سے اس وحشت سے انگلیاں اُٹھائیں جیسے اسے بے شمار سانپوں نے بیک وقت ڈس لیا ہے !

اس کی بیوی نے جھٹ سے دوپٹے کا وہ کونہ اپنے نیفے میں اڑس لیا اور کوٹھڑی

کی طرف بڑھی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اور تین برس پھر امیر خاں کی چوڑی چھاتی پر سوار ہو کر ناچنے لگے!

اس کی نگاہیں اپنے بچے، اس کے چہرے کی سانولی لکیر ——— کیلے اور سنتروں کے بکھرے ہوئے چھلکوں اور سفید پھندنے والی ٹوپی دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان چیزوں کا نقش اس کے دماغ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ برف کے ڈھیلے پر لکیریں کھینچ رہا ہے!

جمائی کی اونچی آواز آئی۔ امیر خاں نے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منہ کھولے جمائی لے رہا ہے۔ اُس نے تین برسوں کے شور و غل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا ——— کچھ ——— ایک پتلی دبی دبی آواز جو کوٹھڑی میں سے آ رہی تھی ——— امیر خاں سارے کا سارا کان بن گیا ——— آواز آئی "جاؤ، جاؤ، دن چڑھ آیا ہے مُرغ کب کے بانگیں دے چکے ——— جاؤ"

امیر خاں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ امیر خاں کدھر ہے ——— اور یہ امیر خاں کا گھر ہے یا لیوسی کا مکان اور یہ اُس کی بیوی کی آواز ہے یا لیوسی کی ——— یہ کون ہے اور یہ کسے مخاطب کیا گیا ہے اور ——— اور وہ کیا سوچ رہا ہے ——— وہ ——— کچھ نہیں ——— کچھ نہیں!

اندر سے پھر ایک تیز آواز تیرتی ہوئی آئی اور اُس کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح گھس گئی۔ "اٹھو، اٹھو، میں دیکھ آئی ہوں نمبردار کا دروازہ بند ہے ——— اب نکلو بھی یہاں سے ——— نگوڑا تیرہ بھی گھڑکے تو میں اچھل پڑتی ہوں ——— جاؤ، جاؤ بھی۔ پر یاد رہے کل منے کے لئے ریوڑیاں اور جلیبیاں ضرور لیتے آنا۔"

امیر خاں نے روپوں کی پوٹلی نکال کر ریوڑیوں کی گٹھڑی پر دھر دی لیکن یکدم اس

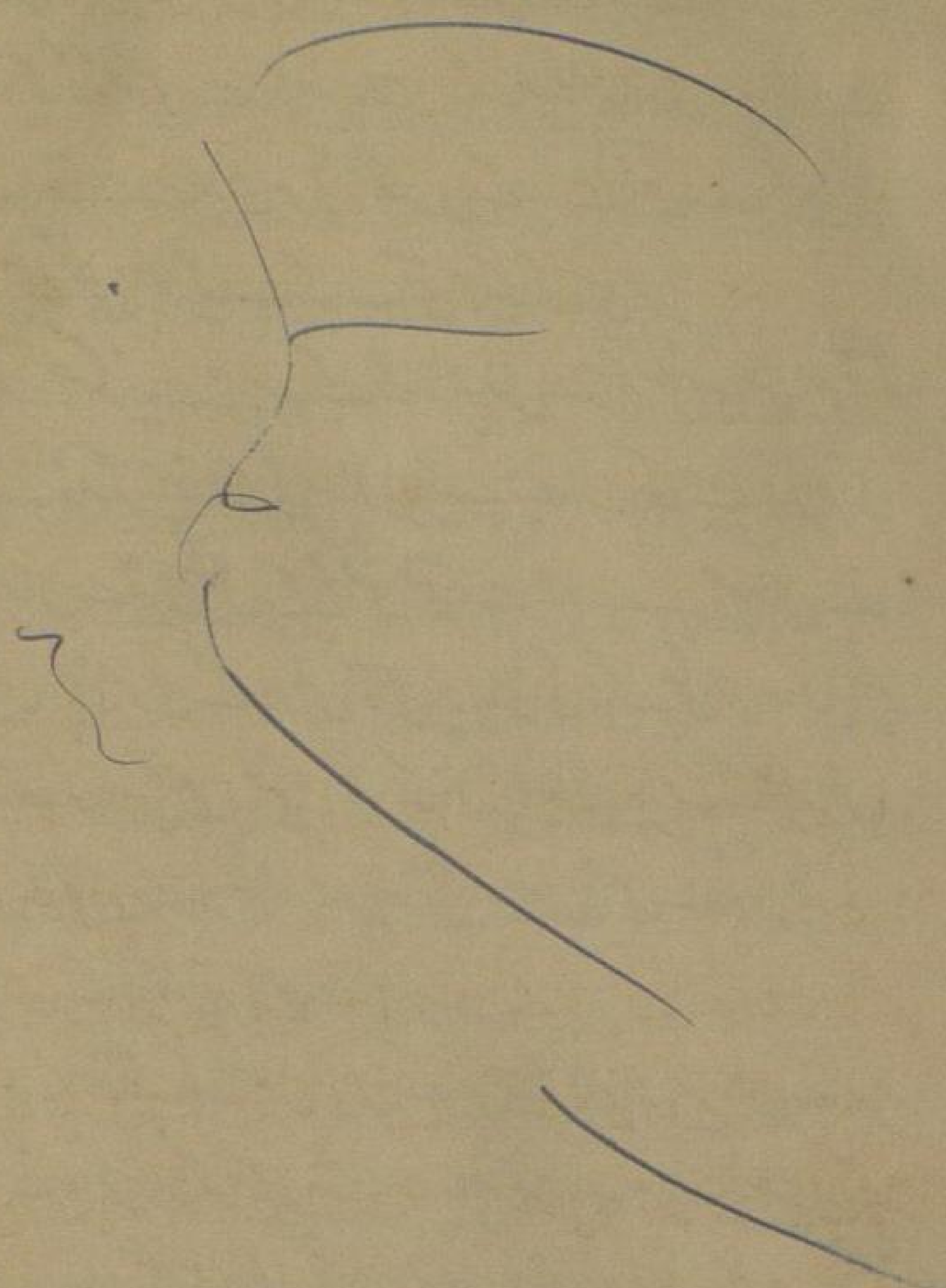
نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ہاتھ کے دباؤ سے ہڈیاں کڑکڑا بولنے لگی ہیں!

اس کا دماغ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا۔ دیا اُسے جھپٹتا وہ باہر کھسکنے لگا اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر اُس نے دیکھا کہ کوٹھری سے اندھیرے میں ایک بھیگا ہوا آدمی باہر نکلا ہے امیر خاں کے تین برس کے واقعات سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے اُس نے انگڑائی لی اور کہا: "لے آؤں گا — پہلے کبھی انکار کیا ہے کہ اب اتنی تاکید کر رہی ہو!"

منّے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور زیر لب کہنے لگا "امیر خاں سے اس کی شکل کتنی ملتی جلتی ہے"

امیر خاں کی بیوی نے بڑھ کر اپنے بچے کی سانولی لکیر پر اپنے لب رکھ دیئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "امیر خاں سے تیری شکل سچ مچ کتنی ملتی ہے!" —— امیر خاں نے دیئے کی دھندلی روشنی میں اپنی بیوی کے دائیں گال پر پانی کی ایک پتلی سی سانولی لکیر دیکھی۔ وہ چیونٹیوں کی طرح لپک کر باہر گلی میں آ گیا! گلی کے نکڑ پر اچانک اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ فرانس کے گاؤں کا وہ نکڑ اسے یاد آ گیا۔ جہاں اُس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں لیوسی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تھا!

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص اُس کے قریب سے گذرا۔ امیر خاں نے کہا —— "السلام علیکم" جانے والا تیورا کر پیچھے ہٹا اور سلام کا جواب دیئے بغیر نمبر دار کے مکان کے سامنے سے دبے پاؤں گذرتا ایک گلی میں غائب ہو گیا ◆



خوش رہو

کشتی کنارے لگی ہیں ملاحوں کو جی ہی جی میں ہزار ہزار صلواتیں سناتا خشکی پر آرہا اور تھیلا ہاتھ میں لٹکا کر پگڈنڈی پر ہولیا۔

گرمیوں کی رخصتیں تھیں اور میں ایک عزیز دوست کے ہاں جارہا تھا۔ جو دریا کے کنارے سے آٹھ میل دور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دے رکھی تھی۔ ورنہ کسی سواری کا انتظام ہوجاتا۔ دراصل میں اسے اپنی آمد سے متعجب کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی تو اسٹیشن پر دو بجے ہی پہنچ گئی اور میں ڈھائی بجے کشتی پر بھی سوار ہوگیا لیکن دریا چڑھاؤ پر تھا اور ملاحوں کے لمبے لمبے چپّو جھاگ اُگلتی ہوئی موجوں کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے کشتی کبھی ادھر مڑجاتی تھی۔ کبھی اُدھر۔ چپّو پانی میں یوں غوطوں پر غوطے لگا رہے تھے جیسے کوئی جاندار چیزیں ہوں اور لپک لپک کر موجوں کو کاٹ کھانا چاہتی ہوں ہم مسافر بھیگ گئے تھے اور چار بجے ہمیں یہ سُن کر بہت رنج ہوا کہ ہم

جانے روانگی سے چند میل آگے جانے کے بجائے ایک میل مخالف سمت کی طرف ہٹ آئے ہیں۔ آخر کنارے سے دو ملاح مدد کے لئے بلائے گئے۔ کشتی میں چند نوجوان مسافروں نے بھی زور لگایا اور بعد مشکل سب کی متفقہ کوششوں سے کشتی کنارے پر آ لگی۔

اب میں دن چھپنے سے پہلے قصبے میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن پست قد گنجان جھاڑیوں سے پٹے ہوتے اس جنگل میں کوئی ایسی آبادی بھی نہ تھی۔ کہ میں وہاں رات بسر کر سکتا۔ خدا کا نام لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پگڈنڈی پر اڑنے لگا۔

اچانک مجھے پیچھے سے کسی نے آواز دی "ٹھہر جاؤ!"

میں گھبرا کر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو گھاٹ پر پولیس کے چار سپاہی کھڑے مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ میری سنہری عینک اور نکھرا ہوا رنگ دیکھ کر سہم گئے اور ان میں سے ایک بولا "آپ جا سکتے ہیں، غلطی ہوئی ہم سے!"

لاحول ولا قوۃ! یہ کیا مذاق ہے! لیکن مجھے چراغ جلے قصبے میں پہنچنا تھا اور پولیس والوں کی اس غیر قانونی مداخلت پر دانت پیسنے کا میرے پاس وقت نہ تھا میں نے پلٹ کر اپنی راہ لی اور نہایت تیزی سے سفر شروع کیا۔

آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور دور افق پر گاہے گاہے بجلی چمک اٹھتی تھی۔ ہوا نمی سے بوجھل ہو رہی تھی اور تمام منظر جیسے بارش کا منتظر کھڑا تھا۔ میرے قدم اس خیال سے اور تیز ہو گئے کہ اگر اس ویرانے میں بارش شروع ہو گئی تو عجب نہیں کہ سردی سے ٹھٹھر کر اکڑ جاؤں۔ یا کسی برساتی نالے کی زد میں آ کر کسی چٹان سے ٹکرا کر مر جاؤں میں کوئی چار میل طے کر آیا ہوں گا کہ اچانک بوندا باندی شروع ہو گئی اور آس پاس فصلوں پر بوندیں ٹپاٹپ ایک مسلسل راگ الاپنے لگیں۔ کھیتوں کے کناروں پر

آگ کے خشک پتّے زور زور سے کھڑکھڑانے لگے میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ مجھے بھوتوں اور دیگر غیر مرئی ارواح پر کوئی یقین نہیں لیکن اب میں محسوس کرنے لگا۔ جیسے ساری کائنات ارواح خبیثہ کے قبضے میں ہے اور جیسے وہ کھیتوں کے کنارے پودوں کی آڑ میں مجھ پر تالیاں بجا رہی ہیں۔ قہقہے لگا رہی ہیں اور مجھے پھانس لینے کے متعلق سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ خوف نے میرے عقب میں کسی کے پاؤں کی چاپ بھی پیدا کر دی۔ بہت دیر تک میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ لیکن جب خوف کی آخری حد پر پہنچ کر محسوس کیا کہ میرا گلا اینٹھ رہا ہے تو آپ سے آپ میری گردن مڑ گئی۔ اچانک بجلی پوری شدّت سے چمکی اور دُور ایک کھڑا ٹھنٹھ پگڈنڈی کے عین درمیان ظاہر ہوا اور اندھیرے میں جذب ہو گیا اس کے بعد بادل اس زور سے گرجا جیسے پہاڑ کروٹ بدل رہے ہیں!

میں اقبال کے اشعار گنگنانے لگا ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

لیکن میری ہراساں گنگناہٹ میرے لئے مصیبت بن گئی۔ مجھے خود اپنی آہٹ پر کسی بھوت کی آواز کا گمان ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے خود اپنا وجود ہی نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے راہ کی بائیں جانب ایک دیا سا ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ یہ شاید ایک جھونپڑی تھی جس کے دروازے پر ایک بے حس و حرکت سایہ سا کھڑا تھا۔ میں نے وہیں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز دی "کیا مسافر کو رات گزارنے کے لئے کوئی کونا کھدرا مل سکے گا؟"

سائے میں حرکت ہوئی۔ ایک اور سایہ فرش پر سے اُبھرا اور دوسرے کے قریب ہو کر پھر جدا ہو گیا۔

"آجاؤ" ـــــ آواز میں بڑھاپا تھا۔

اب گنجان اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ میں جھونپڑی کی طرف بھاگا اور دروازے کے پاس پہنچکر رُک گیا اور بڑھنے لگا۔

"اندر آجاؤ"

میں اندر چلا گیا۔

یہ ایک بہت بوڑھی عورت تھی۔ اس کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ اور چہرے کی جھریوں کا انجام اور آغاز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسکے سارے جسم میں رعشہ تھا اور سر تو بار بار رعشے کی شدت سے اِدھر اُدھر جھک جھک جاتا تھا۔ "تم کہاں سے آرہے ہو مسافر بیٹا" اُس نے کانپتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"گھاٹ سے۔" میں نے تھیلا فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

"گھاٹ سے؟ کشتی آگئی ہے کیا؟ اے رشیدہ۔ کشتی گھاٹ پر آگئی۔ یہ مسافر وہیں سے اتر کر آرہا ہے۔"

ایک لڑکی دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر شفق سی پھول کر رہ گئی۔ اُس نے لجا کر نیچے جو دیکھا تو میں سمجھا۔ آسمان اپنے ستاروں سمیت زمین پر آرہا ہے۔ یونہی نیچی نظریں کئے وہ بولی "مگر امی، بھیا نہ آیا۔"

"آرہا ہو گا۔ یہ مسافر تو بہت تیز آرہا ہے، ہانپ رہا ہے بے چارا۔ گھبرا گیا ہے بارش سے۔ اسے کھاٹ پر چادر ڈال دے۔ اے میاں مسافر آرام کرو تم۔ ہم تو

آج رات جاگتی رہیں گی۔ آج میرا بیٹا آرہا ہے!"

کتنی معصومیت اور کتنی محبت تھی۔ ان دو روحوں کے انتظار میں! کتنا خلوص تھا ان دو پاکیزہ سینوں میں۔ "میرا بیٹا آرہا ہے"۔ "میرا بھیا آرہا ہے!" زندگی بھی عجیب چیز ہے یہ آرزوئیں، یہ اُمیدیں، یہ انتظار! کبھی وہ یہاں سے پردیس سدھارا ہوگا۔ انکی آنکھیں بھیگ گئی ہوں گی۔ پھر راتوں کو انہوں نے سربسجدہ ہوکر دعائیں مانگی ہوں گی۔ نذریں دی ہوں گی۔ پیرجی کے پاؤں چومے ہونگے بیناسیوں سے پتر پے پھنکوائے ہوں گے۔ بزرگوں کے مزاروں پر رنگدار کھدر کے غلاف چڑھائے ہوں گے "میرا بیٹا جیتا رہے" "میرا بھیا دولہا بنے" اور آج اس کی واپسی کا دن ہے۔ وقت اپنی تیز رفتاری کو کیسے کیسے بوقلموں پردوں میں چھپائے بیتا جا رہا ہے!

"کھانا کھاؤ گے میاں مسافر؟" بڑھیا نے پوچھا

لیکن میرے پاس کھانے کا کافی سامان موجود تھا میں نے شکریہ ادا کیا تھیلا کھولا۔ ڈبل روٹی اور آم کے مربے سے خوب سیر ہوا۔ کوٹ ایک طرف برتنوں پر ڈال دیا۔ ٹوپی لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر رکھدی اور کھاٹ پر ہو بیٹھا۔ شیدو نے چادر بچھا دی تھی۔ اس دوران میں اُس نے اپنے سارے جسم کے اردگرد کچھ ایسے طریقے سے دوپٹہ لپیٹ لیا تھا کہ مجھے اُس کی آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ اور اُس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایک بار دروازے کی طرف مڑتے ہوئے اُن میں دئیے کا جو عکس پڑا تو میں سمجھا باہر بجلی چمک اٹھی ہے۔

میں نے بڑھیا سے پوچھا "ماں۔ کہاں گیا ہے تیرا بیٹا؟"

بڑھیا اسی طرح باہر دیکھتی ہوئی بولی "مزدوری کرنے بیٹا۔ وہ کوئٹے میں مزدوری کرنے

گیا تھا۔ چار سال ہوئے کوئٹے میں بڑی آفت آئی تھی تم نے سنا ہوگا۔ سارا شہر زمین پر بچھ کر رہ گیا۔ ہم سے آدھ میل دور ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے نمبردار نے ہمیں بتایا کہ کوئٹے میں مزدوروں کی ضرورت ہے، بٹیا گبرو تھا۔ رضامند ہو گیا۔ مجھے بھی اس کے بیاہ کے لئے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اللہ کا نام لے کر چل دیا۔ وہاں دو سال کاٹ کر آ رہا ہے ہر مہینے دس روپے بھیجتا رہا ہے۔ میں نے پچھلے سال گاؤں میں ایک لڑکی بھی ڈھونڈھ نکالی۔ خوبصورت اور سگھڑ۔ کپڑے پر یوں پھول کاڑھتی ہے۔ جیسے کسی نے سچ مچ کا پھول توڑ کر دھر دیا۔ اس کے ماں باپ نے جو سنا کہ نواز آنے والا ہے تو کہنے لگے۔ کہ بیاہ کی تاریخ مقرر کر دو۔ میں نے کہا وہ آئیگا۔ کچھ روز آرام کرے گا۔ پھر تسلی سے سب کچھ ہو جائے گا۔ کہنے لگے نہیں جو بات کل ضرور ہوتی ہے۔ وہ آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔ انہوں نے تو کل کی تاریخ مقرر کر دی میں نے چیخ پکار کر پرسوں کا دن منوایا ہے۔ ہفتہ سے ہمارے ہاں گاؤں کی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ رات بھر گانے گائے جاتے ہیں۔ ناچ ہوتے ہیں۔ ڈھولک پر جو تھاپ پڑتی ہے، تو پو پھٹے تک کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ چاند ڈوب گیا اور تارے ماند پڑ گئے۔ پھر جو یہ تھک کر سوتی ہیں تو بٹیا میں انہیں دیکھ کر بہت ہنستی ہوں۔ ایک کا سر دوسری کی ٹانگوں پر ہے۔ تو دوسری کی ٹانگیں تیسری کے سر پر! بس ٹانگوں باہوں اور بالوں کا جال بچھ جاتا ہے! پرسوں آدھی رات کو دیئے کا تیل ختم ہو گیا بتی اوپر چڑھاتی گئیں، چڑھاتی گئیں۔ ساری بتی راکھ ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ پر ڈھولک اسی طرح بجتی رہی۔ اندھیرے میں ناچ بھی ہوا۔ آج رات بارش کی وجہ سے نہیں آ سکیں ہم نے کپڑے تیار کر رکھے ہیں۔ گندم خرید لی ہے۔ کچھ زیور بھی بنوا لئے ہیں۔ ادی شنیدہ وہ چاندی کے کڑے تو میاں مسافر کو دکھا دے۔ ہائے ہائے تو تو سمٹی جا رہی ہے۔

اپنا بھائی ہے تیرا. شید و تم سے شرما رہی ہے مسافر بیٹیا! پرسوں تم بھی نواز کی شادی دیکھ کر چلے جانا ہمارے علاقے کا میراثی ایسی شہنائی بجاتا ہے کہ لاہور والے بھی سُن پائیں تو منہ میں انگلی ڈال لیں۔ ٹھہر سکو گے کل کا دن؟

میں بڑھیا کی ہلکی پھلکی تقریر بغیر اکتائے سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ بڑھیا جس نے تقریباً ستر سال اس جھونپڑی میں گزارے۔ شدت کی گرمیوں میں کھیتوں کی نگہبانی کی سردی میں ٹھٹھرتی رہی۔ رنج بھوگے۔ مصیبتیں سہیں۔ آج یوں باتیں کر رہی ہے جیسے اُس کے من پر ایک ذرا سی خراش تک بھی نہیں! اُمید کتنی بڑی ساحرہ ہے!

مَیں نے کہا: "ماں جی! مجھے قریب ہی ایک گاؤں میں جانا ہے. پرسوں شادی کے وقت میں ضرور یہاں پہنچ جاؤں گا"

وہ دروازے سے ہٹ آئی اور وفورِ مسرت میں اس زور سے ہنسی جیسے کوئی ٹین کے ڈبے میں پتھر ڈال کر کھڑکھڑائے! بولی "ہے میرے بچے، تو کتنا اچھا ہے ضرور آئیو اور میرے نواز کی گلابی رنگ کی واسکٹ پر سیپ کے اَن گنت بٹنوں کی بہار دیکھیو جو شیدو نے خاص اُس کے لئے تیار کی ہے!"

شیدو نے بھی کڑے نکالتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا! اور میں سمجھا مجھ پر کسی نے چنبیلی کے پھولوں کی بارش برسا دی ہے!

میں نے کڑے انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا: "اوہ! بہت خوبصورت ہیں یہ کڑے بہت اچھے ہیں، سنار نے غضب ڈھایا ہے، یہ نقش دیکھو، یہ پھول دیکھو اور صفائی کیسی ہے ان میں۔ کیسے چمک رہے ہیں! کتنے بھاری ہیں! بڑی چاندی خرچ آئی ہو گی ان پر؟"

بڑھیا ہاتھ ملتے ہوئے بولی "آدھ سیر، پوری آدھ سیر!" بڑھیا کی سانس پھول رہی تھی: "دو پاؤ"۔

"اللہ کرے تیری بہو سو سال تک سہاگن رہے!" میں نے کرٹے واپس دیتے ہوئے کہا۔ شیدو نے اب اپنا دوپٹہ ڈھیلا کر دیا تھا۔ اب مجھے اُس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ صاف ستھرا جیسے مصفا جھیل پر پورے چاند کا عکس!

میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے تم کب سوؤ گی؟"

"آج رات تو ہم نہیں سو سکیں گی۔ آج رات تو نواز آرہا ہے۔"

میں مسکرایا۔ وہ دونوں دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند کہاں۔ میں اتنے ہلکے پھلکے ماحول میں اپنے آپ کو ان دونوں کی مسرتوں سے بیگانہ نہ رکھ سکا۔

اور ابھی تک نواز کیوں نہیں آیا!

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا!

میں بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اور شاید اس دوران میں میری آنکھ بھی لگ گئی میں نے محسوس کیا کہ نواز کھیتوں کی مینڈھوں پر سے پھلانگتا جھاڑیوں پر سے کودتا جھونپڑی کی طرف ہنستا ہوا بڑھا آرہا ہے! میں چارپائی پر اُٹھ بیٹھا۔ دونوں اسی طرح دروازے پر دم بخود کھڑی تھیں۔

میں نے پوچھا: "نواز نہیں آیا؟"

"ابھی تک نہیں آیا۔"

بارش بند ہو گئی؟

"کب کی"

"نواز کیوں نہیں آسکا۔"

"خدا معلوم۔" بڑھیا اب دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "شاید بارش کی وجہ سے رک گیا ہو۔"

رشید و بولی: "ہاں بادل خوب گرج رہا تھا!"

یہ دل کو تسکین دینے کے طریقے! اے اللہ! زندگی بھی کتنا عجیب معمّہ ہے! مگر اُسے اب تک آجانا چاہئے تھا! میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کی تلاش میں کم از کم ایک میل تو جاؤں۔ ان دونوں نے مجھے بہت روکا۔ لیکن میں کھیتوں کو عبور کر کے پگڈنڈی پر آگیا۔ جو اب ننھی سی ندی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ نصف چاند دور اُفق پر ہولے ہولے پیلا پڑ رہا تھا! اور کہیں کسی درخت پر کبھی کبھار کوئل اپنا غمگین نغمہ الاپ رہی تھی۔ میری ہلکی پھلکی روح پر ایک بوجھ سا آپڑا!

میں نے پاگلوں کی طرح آوازیں دینا شروع کیں ——— "نواز ——— او محمد نواز۔"

ایک خرگوش ایک جھاڑی سے نکلا اور کھیتوں میں چھپ شپ کی آواز پیدا کرتا ہوا کبھی اور جھاڑی میں گھس گیا۔

پگڈنڈی پر دور وہی کبڑا درخت کھڑا جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا! میں خوفزدہ ہو کر واپس جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ میں سمجھا درخت کے اس طرف بہت دور کوئی بہت مبہم سا یہ حرکت میں ہے۔ میرے تو جیسے پر لگ گئے ہیں۔

دونوں سائے اسی طرح دروازے پر بےحس و حرکت کھڑے تھے!

مجھے خاموش دیکھ کر شاید اُن کے دل دھک دھک کرنے لگے کیونکہ دل کی

ہر ضرب پر اُن کا وجود دھیرے سے کانپ جاتا تھا!

"مَیں نے کہا" اب تو پو پھٹنے کو آئی۔ شاید وہ گھاٹ سے اب روانہ ہوا۔ مَیں نے اسے بہت آوازیں دیں۔"

دونوں چپ کھڑی رہیں۔ آخر بڑھیا نے رشیدو کو کہا "تو جا کر حلوا تو دیکھ۔ ٹھنڈا نہ پڑ گیا ہو اور بیروں سے چیونٹیاں تو نہیں چمٹ گئیں۔ کھیر پر کوئی برتن رکھا تھا تو نے؟ کوئی مٹی نہ گر پڑے! نواز تیرا مذاق نہ اڑائے' چھوکریاں بھی تو نہ آئیں۔ ورنہ رونق رہتی جی بہلا رہتا۔"

مَیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دیا ٹمٹما تا رہا مشرق کی طرف پو پھٹ رہی تھی۔ دونوں معصوم روحیں دروازے پر بے جان بتوں کی طرح کھڑی تھیں۔ کہ اچانک ان میں حرکت ہوئی۔

"وہ کوئی آ رہا ہے۔"

"وہ کھیتوں کے پار، پگڈنڈی پر۔"

مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں کہاں؟"

اب رشیدو کا حجاب جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دور اشارا کرتے ہوئے بولی: "وہ، وہ" —— میرا ہاتھ جو اس نے پکڑا . . . . تو مَیں سمجھا بجلی کا ایک تیر میرے سر اور پاؤں سے سنسناتا ہوا نکل گیا ہے!

میں نے باہر آ کر آواز دی "محمد نواز"

کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ مگر مجھے جواب نہ ملا۔

"بھیا نواز" رشیدو اپنی باریک آواز کو کوئل کی طرح پوری قوت سے بلند کرتے

ہوئے پکاری مگر اُسے بھی جواب نہ ملا!

"وہ ہمیں حیران کرنا چاہتا ہے۔" بڑھیا مسکراتی ہوئی بولی۔

اب وہ ہم سے پانچ قدم کے فاصلے پر تھا۔ بڑھیا ہانپ رہی تھی۔ شیدو کانپ رہی تھی! ——— چار قدم ——— تین قدم!

"نواز" دونوں یک زبان ہو کر اُسے گلے لگانے کے لئے دو قدم آگے بڑھتی ہوئی پکاریں۔

"مَیں نواز نہیں ہوں۔"

"ہائیں!"

"اوئی" شیدو نے اُسے چھو لیا تھا!

"تو پھر تم کون ہو؟" بڑھیا جیسے اُسے دبوچ لے گی۔

"میں پولیس کا سپاہی ہوں۔"

ہم تینوں کے دل دھک سے رُک گئے اور پھر یوں دھڑکے جیسے ابھی پھٹ کر بکھر جائیں گے!

"میں تھانے میں سپاہی ہوں، نواز میرا بچپن کا دوست ہے۔ وہ کشتی سے اُترا اور ادھر آنے لگا کہ تھانیدار نے تین چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُسے پکڑ لائیں کیونکہ افسر مال صاحب کا اسباب بنگلہ پر پہنچانا تھا اور اس وقت بیگار پر اور کوئی آدمی نہ پکڑا جا سکا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میرے گھر اطلاع دیدینا"

"لیکن وہ کب آئے گا؟" بڑھیا جیسے گر جائے گی!

"ایک ہفتے کے بعد۔ بنگلہ پر اس کو افسر مال صاحب کے دفتر کا پنکھا بھی کھینچنا ہے!"

بڑھیا دیوار سے لگ گئی اور پھر ہولے ہولے نیچے کھسکتی زمین پر بیٹھ گئی اور رشید و کا چہرہ! ـــــ جیسے چھوئی موئی کسی کے مس سے مرجھا کر بے رونق ہو جاتی ہے!

اور اس سپاہی کچھ دیر تک بڑھیا کو دیکھتا رہا اور پھر ہولے ہولے قدم اٹھاتا کھیتوں کے ورے غائب ہو گیا۔

میں نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر سے تھیلا اٹھایا باہر آیا۔ رشیدو کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر افق کے قریب ڈوبتے ہوئے تاروں کی طرح چمک رہے تھے! اور بڑھیا اپنا نچلا ہونٹ اپنے پوپلے منہ میں ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی:۔

"جانتے ہو بیٹا؟"

"ہاں ماں"

اچھا خوش رہو!"

سپنوں کا محل

اور اک اور شعور کی پرلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنا لیا ہے۔ جو عنبر اور لوبان کی خوشبوؤں سے لبریز اور کافوری فانوسوں کی شمعیں روشنیوں سے منور ہے یہاں مَیں نے اپنی امیدوں کی رانی کو ایک زمردیں سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے میں گیت گاتا ہوں۔ وہ طاؤس بجاتی ہے اور پریاں ہمارے سروں پر آ کر منڈلاتی ہیں اور اپنے پروں کو اس طرح پھڑپھڑاتی ہیں۔ جیسے خاموش خوابگاہوں کے ریشمی پردے سرسراتے ہیں۔ میری اس شہزادی کا نام خدا جانے کیا ہے۔ لیکن میں اسے شہزادی ہی کہہ کر پکارتا ہوں۔ کیونکہ اس کے انداز میں شاہانہ وقار اور امیرانہ طنطنہ ہے!

واللہ مَیں شاعری نہیں کر رہا۔ آپ شاید میرے جذبات و احساسات میں دلچسپی محسوس نہ کریں۔ کیونکہ یہ بھاپ اور فولاد کا زمانہ ہے سائنس کے مادی نظریات کا دَور

دورہ ہے۔ "یہ کیوں" اور "یہ کیسے"؟ اور "کب" اور "کہاں" کا راج ہے اور میں باتیں کر رہا ہوں، خوابوں کی دنیا کی۔!

یہ جو گاؤں سامنے نظر آ رہا ہے نا، یہیں میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اُپلے تھوپ رہی تھی گلی کے کنارے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار تھا، راستہ نہ پاکر میں نے کہا: "لڑکی، ذرا ادھر ہو جا، تاکہ گھوڑا گزر جائے۔"

"ذرا دیوار سے لگ کر نکل جا۔" وہ اپنی خوابگوں پلکیں اٹھا کر بولی اور میں دیوار سے لگ کر نکل گیا۔ پاؤں چھل گیا دیوار سے رگڑ کھا کر۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی تحکمانہ چمک، نے مجھے کسی گلے شکوے کی مہلت نہ دی۔ محکمۂ انہار کے فولادی دل رکھنے والے ضلعدار پر اُپلے تھوپنے والی نے ایک ایسا بے پناہ تیر پھینکا کہ فولاد موم کی طرح گداز ہو گیا اور نبضیں پھڑکنا اور آنکھیں جھپکنا بھول گئیں!

جب میں ذیلدار سے مل کر پلٹا تو وہ چھت پر کھڑی منڈیر پہ گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔

میں نے کہا: "لڑکی ہو سکے تو ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ لا دے۔ پیاسا ہوں اور سفر طویل ہے۔ راستے میں کوئی ندی بھی نہیں پڑتی، اور دھوپ بھی تیز ہے!"

بولی: "چھاچھ پی لوگے کیا؟"

میں نے کہا: "اگر خود تو نے ہی دودھ بلو یا ہو تو چھاچھ ہی پلا دے۔!"

"کیا مطلب؟" اُس نے اوڑھنی کا پھڑ پھڑاتا ہوا پلّہ سینے پر پھیلا دیا اور چتون پر بل لا کر مجھے شاہانہ انداز سے گھورنے لگی۔

میں نے گھبرا کر کہا: "میرا مطلب یہ ہے کہ میں وہی چھاچھ پیوں گا جو خود تو نے تیار

کی ہو گی۔ آخر تم زمینداروں کے ہاں غلیظ نائنیں اور دھوبنیں بھی کام کرتی ہیں نا!"

"نہیں بھئی!" وہ بولی "میں خود بلوتی ہوں۔ ہم اتنے بڑے زمیندار نہیں!"

"اچھا! تو غریب گھرانے کی ہے یہ لڑکی! میری سرمایہ دارانہ رگ پھڑکی۔ اور جب وہ چھاچھ لیکر آئی تو بولی "تو کہاں جائے گا؟"

"لائل پور" میں نے کہا

"بہت بڑا شہر ہے؟" اس نے پوچھا۔

اور میں نے جواب دیا "ہاں بہت بڑا شہر ہے، تمہارے گاؤں سے دس گنا بڑا۔ وہاں یہ چھاچھ واچھ نہیں پیتے ہم لوگ۔ وہاں تو انگریزی شربت ہوتے ہیں"

"شکر کے شربت؟"

"نہیں انگوروں کا رس!"

"اچھا!" اس نے بھویں سکیڑ کر کہا اور پیالہ لیکر اندر چلی گئی۔

اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ اس گاؤں میں میرا دورہ کتنے روز ہوتا ہوگا۔ مہینے میں پندرہ دن۔ اور ان پندرہ دنوں میں اگر ایک شخص للچائی ہوئی نظروں سے ایک لڑکی کو دیکھے تو دونوں دلوں کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں سو میرے دل کے خفتہ تار بھی جھنجھنائے ادھر سے بھی میں نے خوابگوں پلکوں کی جھپک میں یہ جھنجھناہٹ سنی۔ میری کنپٹیوں کے قریب جل ترنگ سے بجنے لگے۔ ادھر اس نے چھت کی منڈیر کے پاس میری تاک میں بیٹھنا شروع کر دیا میں گلی میں سے گزرتا تو کہاں سے ایک کنکر میرے ملبے کلاہ پر! ——" ارے کون؟" میں تجاہل عارفانہ سے پوچھتا اور وہ گلی میں ادھر ادھر جھانک کر بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہتی "بھتنی!" —— اور فضا میں ہزاروں پریاں

پر پھڑانے لگتیں۔

میں ذیلدار کی چوپال میں رات کو سوتا تھا اور جب سب غافل ہو جاتے تو میں وہاں سے کھسک کر آتا۔ گاؤں کے کتے ہر راہ چلتے کو دیکھ کر بھونکنے میں شہری کتوں سے زیادہ دریا دل واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے میری دونوں جیبیں بڑے بڑے کلچوں سے بھری ہوتیں گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ اپنے بوڑھے والدین کے ہمراہ چھت پر سویا کرتی تھی میں دیوار کے ساتھ لگ کر نہایت مدھم آواز میں کھنکارتا اور کہتا "بھتنی" اور منڈیر پر سے اسکا سر بلند ہوتا بال بکھرے ہوئے، چولے کے بٹن کھلے ہوتے۔ اپنا سڈول بازو نیچے لٹکا کر کہتی "اور رے ابا ابھی خراٹے نہیں بھر رہے اور ماں ابھی مچھروں کی وجہ سے گھٹنے کھجلا رہی ہے۔ پرلی گلی میں نکل جا!"

اور میں کہتا "اری ادھر تو بڑا خوفناک کتا ہے کسی کا کمبخت کلچے بھی قبول نہیں کرتا"

اور وہ مڑ کر چھت پر نگاہیں دوڑاتی اور پھر پلٹ کر کہتی "میں آئی!" ——— اور پھر ہم دونوں گلیوں میں چھپتے چھپاتے باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ مینڈھوں پر شبنم آلود گھاس سے جب ہمارے پاؤں مس ہوتے، گنجان کھیت سرسراتے، ٹڈے ہیں ہیں کرتے رات سنسناتی، اور جب دور جیسے ستاروں کے قریب سے ٹیٹیری کی درد بھری الاپیں سنائی دیتیں تو ہمارے دلوں میں گھنگھروؤں کی جھنکار سی بلند ہوتی۔ ہماری انگلیاں اسقدر ٹھنڈی ہو جاتیں جیسے ہم کرہ زمہریر میں محو پرواز ہیں اور ہماری کنپٹیاں یوں تپنے لگیں جیسے دھوپ میں ریت! ہم وہیں شبنم آلود گھاس پر بیٹھ جاتے یا صحیح الفاظ میں گر جاتے وہ میری قمیص کے بٹنوں کو گھماتی اور پھر انہیں توڑ کر گنجان کھیتوں میں پھینک دیتی ——— ایک سیمیں قہقہے کے ساتھ!

مَیں کہتا "اری اگر میں تیرے چولے کے بٹن اسی طرح توڑ کر پھینک دوں تو پڑی چیخے گی !"

اور یہ سُنکر اس کا جسم ڈھیلا سا پڑ جاتا۔ جیسے ریشم کی گٹھڑی کی گرہیں آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔ اُس کی زبان گُنگ ہو جاتی۔ جیسے ہسپتال کی کوئی الھڑ نرس شب بیداری سے تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ مَیں اُسے جھنجوڑتا اور وہ پرے کھسک کر کہتی "ارے تو ایسی باتیں نہ کیا کر! میرا دم گھٹنے لگتا ہے"!

"دم گھٹنے لگتا ہے تیرا؟" مَیں اُسے چھیڑتا اور وہ ہولے ہولے بڑبڑاتی کھیت کے پرلے سرے پر جا کر بیٹھ جاتی اور پھر ہماری گفتگو بہت سے پلٹے کھاتی۔ گندم کا نرخ۔ گندمی رنگ۔ گاؤں کے متعفن گھورے۔ لاہور کا لارنس، دلی کا چاندنی چوک اور پھر ——
"ابا جاگ پڑے تو سمجھو کل میری چوٹی کٹ گئی۔"

میں کہتا "میں لاہور سے تمہیں مصنوعی بال لادوں گا۔ ابریشمی بال، چاند کی کرنیں۔"
وہ کہتی "دودھ کو بہت زیادہ بلویا جائے تو مکھن پگھل جاتا ہے۔ اور چھاچھ بے مزہ ہو جاتی ہے لیکن تم کیا سمجھو چھاچھ واچھ کی باتیں؟ تم تو پینے کی چیزوں کے عجیب عجیب سے نام لیتے ہو۔ بتاؤ تو وہ ایک نام؟"

اور میں کہتا: "اورینج سکوئیش، جانی واکر، برانڈی ایکشا نمبر وَن۔"

"بڑے مزیدار ہوں گے یہ شربت؟" وہ پوچھتی۔

اور میں کہتا "ہاں کبھی پلاؤں گا تمہیں۔"

"کب؟" وہ پوچھتی۔

اور یہ سوال سن کر میرے دل و دماغ پر سنگین تاریکیاں پھیل جاتیں۔ احساسات کا

دھارا ایک لخت تذبذب کے ریگزار میں غائب ہو جاتا۔ زبان ڈھیلا بن جاتی ہیں اُسے اس "کب" کا جواب دینا چاہتا مگر نہ دے سکتا مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ مَیں بزدل تھا مَیں جانتا تھا کہ اگر میرا جواب اُسے بُرا لگا تو پھر وہ اپنے فطری شاہانہ طنطنے کو بروئے کار لا کر مجھے ٹھکرا کر گاؤں کو چل دے گی اور مجھ سے یہ راتیں بھی چھن جائیں گی۔ وہ میری پسلیوں میں ٹہوکا دیکر کہتی "ارے کب؟"

اور مَیں کہتا "جب اللہ نے چاہا"

ہنسی کو ضبط کر کے وہ چٹکی بجاتی اور زبان اور تالو کی مدد سے پٹاخہ سا چلا کر کہتی "ارے تو تو ملّاں ہے۔!"

ملّاں! ــــ یعنی بزدل اور کم ظرف اور ریاکار اور جھوٹا اور فریبی اور لالچی اور ــــ اور ــــ اور مجھے ہر طرف طاعون زدہ چوہوں کا تعفّن سا محسوس ہونے لگتا!

اور جب میں چوپال پر واپس آتا تو دل میں جیسے بھڑیں ڈنک پر ڈنک لگائے جا رہی ہیں، کانوں کے قریب بھنبھنا رہی ہیں قمیص میں گھس کر بدن پر رینگتی پھر رہی ہیں ــــ ایے ہے! ــــ میں چادر کو لاتوں کی چرخی چلا کر پرے پٹخ دیتا تکیہ مروڑ کر پھینک دیتا اور پھر اچانک اپنے پٹھوں کو اکڑا کر کہتا "ارے ہمّت کر۔ ہمت کر کمبخت! عورت کے انداز میں چاہے کتنا ہی وقار کیوں نہ ہو۔ آخر وہ عورت ہے۔ یعنی مجسّم کمزوری، مرد کی غلام۔ عورت آخر عورت ہی ہے نا!" ادھر مجھے ہیر یاد آجاتی ــــ کہ کیسے وہ رانجھے کے عشق میں پریشان رہی اور سسّی، کہ کیسے وہ گھر بار چھوڑ کر تھل کے ویرانوں میں جا بسی اور سوہنی ــــ اور شیریں ــــ اور لیلےٰ ــــ اور ــــ اور کلوپٹرا!" یہاں پہنچکر میرے دماغ میں نشتر سے تیر جاتے "کلوپٹرا تو ملکہ تھی ــــ شہزادی! ــــ ٹرا

دھار تھا اس میں ―― وُہ انطونی سے عشق نہیں کرتی تھی کھیلتی تھی اس سے! ――
لیکن آخر وُہ بھی عورت ہی تھی نا؟ ―― اور پھر سانپ کی مدد سے اُس نے اپنی نسوانی کمزوریوں کا مظاہرہ بھی کر دیا تھا!"

بہت رات گئے تک میں یہی سوچتا رہتا اور جب لائل پور واپس آتا تو میری رگ و پے میں نئی زندگی سی حلول کر جاتی۔ اور میں مصمم ارادہ کر لیتا کہ اب کے نوائے اس کمبخت "کب" کا جواب دے ڈالوں گا۔ اگر اُس نے بُرا مانا تو جائے گی کہاں ۔ اٹھوا لوں گا اُسے!

اور ایک بار جب میں لائلپور سے چلا تو یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں نپولین ہوں۔ اور روس پر یلغار کرنے جا رہا ہوں نصف شب کو میں چوپال پر سے اُٹھا تو اُس کے مکان کی دیوار سے لگ کر بولا: "ہے بھتنی!"

منڈیر پر سے جھک کر وُہ بولی: "ہائے آ گئے تُم؟ ―― میں تو اداس ہو گئی تھی"

اور جب ہم باہر کھیتوں میں شبنم آلود گھاس پر جا کر گر پڑے تو یوں ہی باتیں کرتے کرتے میں اُسے چھاچھ اور جانی واکر کے موضوع کی طرف کھینچ لایا۔

"کبھی بلاؤں گا نہیں" میں نے کہا

"کب؟" اُس نے پوچھا

―― اور کائنات قلابازی کھا گئی! ستارے ایک دُوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگے کھیت اُوپر اُٹھ کر فضاؤں میں معلق ہو گئے۔ دل و دماغ کی طنابیں کھنچ گئیں میرا دل ایک سیکنڈ میں سو بار دھڑک گیا ہو گا۔ میں نے کانپتے ہوئے اپنی جیب سے روپوں سے بھرا ہُوا بٹوا باہر نکالا اور اُس کی اُنگلیوں میں تھما کر بولا: "نہیں اب کے ہمیشہ کے لئے ساتھ

سے جاؤں گا نا! بس اب تم ہو گی اور لائل پور کے کھلے بازار!"

اور بٹوے میں سکوں کا چھنا کا سُن کر وُہ ایک لمحے کے لئے مجسمہ کی طرح جم کر رہ گئی۔ اور پھر اچانک بٹوا دور کھیتوں میں پھینکتے ہوئے بولی "ارے سوداگر کہیں کے۔ تو مجھے خریدنے آیا ہے۔ ارے بدھو۔ کیا تو نے مجھے ربڑ کی گڑیا سمجھ لیا ہے کہ دو کوڑی دے کر مول لے لیگا۔ بدمعاش کہیں کا۔ لچا۔ شہدا!"

اور وُہ اونچی نیچی مینڈھ پر ناگن کی طرح تیرتی اندھیرے میں گھل گئی!

نپولین کی روس پر یلغار اور پھر اس کی افسوس ناک پسپائی! ——— میں نے اپنے بال نوچ لئے۔ جی چاہا بڑھ کر اُسے اٹھا لوں اور کاندھوں پر ڈال کر سامنے جنگل میں لے جاؤں اور اسے اس قدر پیٹوں کہ اس کے ——— اس کے چوڑے کے بٹن ٹوٹ کر الگ جا گریں ——— لیکن میرے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے۔ میرا جسم سو گیا تھا!

دوسرے روز صبح سویرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر لائلپور کو روانہ ہوا۔ جب اُس کی گلی سے گزرا تو ہلکے ہلکے دودھ بلوئے جانے کی آواز کے ساتھ مجھے ایک گیت سنائی دیا ؎

دھیرے دھیرے بلو ری سہیلی
مکھن پگھلا جائے

بس اس کے بعد اُس گاؤں میں دُور سے پر کبھی نہیں گیا۔ یہیں سے کھیت وغیرہ دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے وحشت سی ہوتی ہے وُہ گلیاں دیکھ کر، اور اسی لئے اور اک اور شور کی پہلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنایا ہے جو عنبر اور لوبان کی ——— ہائیں! آپ تو مسکرا رہے ہیں!

مانو کی میاؤں

داداجان کے انتقال کے بعد بہت دنوں تک ہم سب پر مردنی سی چھائی رہی۔ اور در و دیوار پر افسردگی سی برستی رہی۔ اُن کی محبوب بلّی "مانو" نے بھی ان کے رخصت ہوتے ہی چپ سادھ لی تھی لیکن جب کبھی سوتے میں یا بھولے سے وُہ نحیف مریل آواز میں "میاؤں" کا بھولا بسرا گیت گنگناتی تو دادی اماں اپنی بے ربط چیخوں سے گھر بھر کو سر پر اٹھا لیتیں اور اتنی دیر تک روتی رہتیں کہ مجبوراً ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ دراصل مجھے داداجان کے انتقال پر افسوس نہ ہوا تھا اور نہ خوشی ——— میں نے تو اسے بس ایک معمولی واقعہ جانا جیسے نرگس کے ہاتھوں سے کانچ کا پیالہ چھوٹ کر سنگین فرش پر کرچی کرچی ہو گیا یا دادی اماں کا پاؤں مانو کی دم پر پڑ گیا اور مانو کی چیخوں سے سب کے دل دھڑکنے لگے۔ نوّے سال بے فکریوں میں گزار کر دہ وہ

دن بیمار پڑے اور تیسرے دن چل دیئے۔ نہ بیماری کوئی اتنی تکلیف دہ تھی۔ نہ سکرات کا عرصہ اتنا طویل تھا۔ دو چار ہچکیوں سے دادا جان کے ڈھیلے ڈھالے پنجر سے روح کھسک کر کہیں اڑ گئی۔ ملاجی کو قرآن مجید پڑھنے کے لئے بھی تو نہ بلوایا جا سکا۔ ادھر دادا جان کی آنکھیں بند ہوتے ہی دادی اماں پکار پکار کر رونے لگیں "ہے میرے آقا! تو نے دنیا کو جی بھر کر بھی نہ دیکھا۔ یہ بھی کوئی عمر ہے میرے مالک" پڑوسنیں بین کر کر کے بھو کا سی ہو گئیں۔ میں اور آپا جان بھی اس مضحکہ خیز اظہارِ افسوس پر حیران تھیں۔ ہمیں جگ ہنسائی کا خوف تھا۔

آخر جس شخص کے مسوڑھے پچھلے دس بارہ سالوں سے دانتوں کا کام دے رہے ہوں جس کی آنکھیں چہرے کی دوسری گہری اور تاریک جھریوں میں گھل مل گئی ہوں اور جس کے کانوں کی لویں لٹک کر اس کے کاندھوں کو چھو رہی ہوں جو ایک قدم بھی اٹھائے تو سانس اکھڑ جائے جس کا کام سوائے مانو کو اپنی گود میں بٹھا کر ہاتھ پھیرنے کے اور کچھ نہ ہو۔ وہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں منتقل ہو جائے تو افسوس کاہے کا! ہر شخص اگر دو دو تین تین سو سال تک جیتے جائے تو یہ دنیا بہت جلد بوڑھی کھوسٹ ہو کر رہ جائے۔ انہیں خیالات کی وجہ سے مجھے بہت کم آنسو آتے تھے اور اکثر مجھے دادی اماں کی تیز نگاہوں سے بچنے کے لئے منہ پھیر کر آنکھوں پر تھوک لگانا پڑتی تھی۔ اگر کسی وقت بغیر کسی کوشش کے کوئی آنسو نکل آتا تو میں اس وقت اتنی خوش ہوتی جتنی دادی اماں، دادا جان کے دوبارہ زندہ ہو جانے کے خیال سے۔

دس بارہ دنوں کے بعد ہمیں کانپور سے ایک چٹھی ملی۔ مرحوم ابا جان کے نہایت عزیز دوست مرزا عباس بیگ معہ اپنے اہل و عیال کے، تعزیت کی خاطر تشریف

لا رہے تھے۔ استقبال کی تیاریاں تو کیا ہوتیں۔ آخر ماتم کا موقع تھا۔ لیکن دادی اماں کے رویہ میں کچھ تبدیلی ضرور رونما ہو گئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے یوں اچانک کھڑی ہو جاتیں اور اس تندہی سے برتنوں کو ترتیب دیتیں، بستر جھاڑتیں اور فرنیچر سنواریں جیسے عنقریب کوئی برات آنے والی ہے۔

جمعہ کے روز مرزا عباس بیگ کو کراچی میل پر تشریف لانا تھا بھائی رشید اور قادر الملازم سٹیشن پہ چلے گئے۔ ہم سب نے مرزا صاحب کا نام تو سُن رکھا تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ ابا مرحوم سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے لیکن جب سے ابا نے وفات پائی تھی مرزا صاحب کا نام ہمارے گھر میں بہت کم لیا جانے لگا تھا۔ دادا جان کی وفات نے ان کی یاد تازہ کر دی تھی اور ہم سب ان کی بیوی اور بیٹی کو دیکھنے کے منتظر بیٹھے تھے کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد موٹر ہمارے مکان کے بڑے پھاٹک پر آکر رُکی ادھر موٹر کے رُکنے کی آواز آئی، ادھر دادی اماں چیخ کر فرش پر ڈھیر ہو گئیں اور چلّانے لگیں "ہائے میرے آقا تم مجھ نا ہنجار کو چھوڑ کر کدھر چل دیئے؟ ساری عمر تم نے میری ناز برداریاں کیں تم کما کر لاتے رہے اور میں ابھاگن تمہاری کمائی دھول کی طرح اڑاتی رہی۔ اب جبکہ ہماری منزل بہت قریب آ چکی تھی۔ تم میرا ساتھ چھوڑ کر کدھر چلتے بنے؟ آج تمہارے مرحوم بیٹے کے پیارے دوست مرزا صاحب تمہیں ملنے آئے ہیں۔ مگر تم منوں خاک تلے پڑے میری فریادیں بھی سُن رہے ہو کہ نہیں۔"

دادی اماں روئے جاتی تھیں اور پکارے جاتی تھیں مرزا عباس بیگ مع اپنی بیوی اور بیٹی کے برآمدے کے ستونوں کا سہارا لئے رو رہے تھے اور ان کا نوجوان بیٹا ایک طرف کھڑا او رمال منہ پر رکھے فرش کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ آپا اور میں نے بھی

رونے کی کوشش کی۔ دو چار ہچکیاں بھی لیں۔ آنکھیں زور زور سے بھینچیں کہ کوئی بھولا بھٹکا قطرہ ڈھلک کر رخسار پر چمکنے لگے۔ پر آنکھیں یوں خشک معلوم ہوتی تھیں جیسے ان میں خاک جھونک دی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد آپا جان نے تو بصد مشکل اپنی داہنی آنکھ سے ایک آنسو نکال ہی لیا۔ اب میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے دوپٹہ سنبھالنے کے بہانے سے گھونگھٹ نکال کر جلدی سے آنکھوں پر تھوک لگالی اور دو چار ہچکیاں اس زور سے لیں کہ رومال والے صاحب بھی چونک کر مجھے گھورنے لگے۔ دادی اماں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا میں نے انہیں اپنی دو چار بے ہنگم ہچکیوں سے مول لے لیا ہے۔ مرزا عباس بیگ، ان کی بیوی کی آنکھیں بھی کہہ رہی تھیں "ہائے انوری! تیرے دادا جان چل بسے!" صرف آپا جان زیر لب مسکرا رہی تھی۔ گو یہ مسکراہٹ صرف میں نے ہی محسوس کی۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد دادی اماں اٹھیں۔ مرزا صاحب کے سر پر ہاتھ پھیرا، ان کے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرا جو شرم سے سمٹ سمٹ گیا۔ انہوں نے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے کہا "انور" ——— میرے دل کو جیسے کسی نے چکی کے دو پاٹوں میں دبا لیا آپا بھی کچھ پریشان سی ہو گئیں۔ دادی اماں نے مرزا صاحب کی بیٹی کے دوپٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اور تمہارا بیٹی؟" اس نے نگاہیں نیچی کئے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا "رشیدہ" میرا بھائی رشید جو مرزا صاحب کے پاس ہی کھڑا تھا۔ یوں کانپ اٹھا جیسے صاف نیلے آسمان سے اس کی ناک پر ایک بوند آگری ہے۔

ہم سب بڑے کمرے میں آ گئے۔ مرزا صاحب ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ دادی اماں مرزا صاحب کی بیوی۔ آپا جان، رشیدہ اور میں فرش پر بیٹھ گئیں۔ رشیدہ اور انور سامنے

دو کرسیوں پر، مرزا صاحب نے دادا جان کی صفات کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ "ایک روز بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مہتر کے ننھے بچے کو بند دکان کے تختے پر پورے زور سے چیخیں مارتے ہوئے دیکھا۔ ان سے نہ رہا جا سکا۔ ایک دوکان سے دونی کی مٹھائی خریدی اور کوڑا کرکٹ سے اٹے ہوئے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اس کے آگے دھر دی اور مجھ سے فرمانے لگے۔ میرزا بیٹا! خدا کو اپنی ساری مخلوق پیاری ہے۔ صرف ہم بندوں نے چھوٹے بڑے اور امیر غریب کے امتیازات گھڑ لئے ہیں۔" میں بے اختیار ان کے اس زرّیں ارشاد پہ آفریں پکار اٹھا۔"

دادی اماں کی ننھی ننھی دھندلی آنکھوں میں بے شمار آنسو کانپ رہے تھے اور کئی ان کی جھریوں میں جذب ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کی داڑھی تو آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی، فرما رہے تھے۔ "پھر بھیا اکرم علی چل بسے۔ میں نے ان کے ساتھ جو گھڑیاں کاٹیں انہیں کم از کم میں خود تو اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔ وہ کوئی الگ زندگی تھی۔ ان کا چالیس برس کی عمر میں انتقال کر جانا! ——— واللہ اس حادثے نے میرے حواس آج تک معطل کر رکھے تھے۔ چالیس سال آخر کیا عمر ہے! اب بھی جب کبھی انور کا ننھا بھائی کہتا ہے "ابا جی! وہ سامنے کس کی تصویر لٹک رہی ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے، کیا یہ چوکھٹے سے اترنا چاہتی ہے"۔ تو خالہ جان! خدا کی قسم میں اس بچے کی طرح رونے لگتا ہوں جس کا نیا نیا کھلونا ابھی ابھی کسی نے پاؤں تلے مسل ڈالا ہو۔ میں نے تو ———"

مرزا صاحب رک گئے۔ سارا کمرہ ششدر رہ گیا۔ دادی اماں نے اچانک بیٹھے بیٹھے چیخنا شروع کر دیا۔ میں اور آپا جان ان کی طرف دوڑیں۔ ہاتھ اور پاؤں ملے۔ دھیمی

اور بھیگی آواز میں تسلیاں دیں۔ مرزا صاحب بھی پلنگ سے نیچے اتر آئے اور گھبرائی ہوئی آواز میں دادی اماں کو سمجھانے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے ان کی ہچکیاں رکیں اور ہچکیوں کی باری آئی۔ ہچکیاں ختم ہوئیں پر آنسو بہے جا رہے تھے۔ خدا جانے ان کی خشک کھوپڑی میں اتنا عرق کہاں سے آ گیا تھا کہ ان کی چادر بالکل بھیگ گئی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر جانے کے لئے اٹھنے ہی والے تھے کہ انہوں نے اپنی گود سے "مانو" نکالی اور سامنے دھر کر پھر روتے ہوئے کہنے لگیں "میرزا بیٹا! یہ ان کی نشانی ہے۔ اسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا۔ ہر وقت ان کی گود میں رہتی تھی۔ خود کھلاتے تھے۔ خود پلاتے تھے۔ اب جب میں اسے سارے کمروں میں پریشان پریشان پھرتے دیکھتی ہوں اور پھر جب یہ اپنی تلاش میں ناکام ہو کر میرے پاس آتی ہے اور دردناک آواز میں میاؤں "کرتی ہے تو مجھ ابھاگن کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے!"

دادی اماں یہاں تک پہنچی تھی کہ بلّی نے دم کھڑی کر کے دادی اماں کی طرف دیکھا اور ایک لمبی دردناک میاؤں کرتی ہوئی پھر ان کی گود میں گھس گئی۔ دادی اماں کو پھر وہی دورہ پڑ گیا۔ سب مغموم ہو گئے۔ میں نے انور کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے جیب سے رومال نکال رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو جھینپ گیا۔۔۔۔۔۔ اور رونی صورت بنانے کی کوشش میں سر جھکا لیا۔

شام کے کھانے سے پہلے میں نے موقع پاکر مانو کو گودام میں بند کر دیا۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں کسی نہ کسی وقت دادی اماں کے اشکبار ہونے کا اندیشہ تھا۔ یوں دادی اماں شوق سے اس مشغلے سے اپنا دل بہلا سکتی تھیں۔ لیکن قہر تو یہ تھا کہ ہم سب کو ان کی چیخوں میں حصّہ لینا پڑتا تھا۔ مہمانوں کے سامنے مصنوعی چیخیں جس ندامت اور خجالت کا

باعث ہوتی ہیں۔ اس کے تصور ہی سے دل و دماغ میں چبھن سی سرسرانے لگتی ہے۔

کھانا کھا کر دادی اماں نے ادھر دیکھا اور مجھے کہنے لگیں "انوری بیٹیا! مانو کدھر گئی گھنٹہ بھر سے نظر نہیں پڑی۔ اسے گھونٹ بھر دودھ پلا دیتیں!"

میں نے کہا: "کسی کونے میں پڑ رہی ہو گی۔ دادا جان کے بعد تو اسے کھانے پینے کی سدھ بدھ ہی نہیں رہی!"

مرزا صاحب کی بیوی ناک پہ ہاتھ رکھ کر بولیں: "حیوان میں بھی کتنی سمجھ ہوتی ہے۔"

میں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا جو دور برآمدے کے ستونوں پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔ انہیں انتظار تھا کہ ابھی مانو اپنا مربع شکل کا سر نکال کر میاؤں پکارے گی اور دادی اماں کے افسوس کے ذخیرے کا ڈاٹ جھک سے اڑ جائے گا۔ میں نے انہیں دھیرے سے ٹہوکا لگا کر کہا "مانو گودام میں بند ہے!"

انور ہمارے قریب بیٹھا تھا۔ میری سرگوشی سن لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ناخن سے ایک پلیٹ کریدر رہا تھا اور زیرِ لب مسکرا بھی رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی پتلیوں کو کھینچ کر آنکھوں کے آخری گوشوں تک لے آیا اور مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" دادی اماں نے پوچھا

"کہیں نہیں۔" میں نے بیٹھے ہوئے کہا

"تو پھر اٹھی کیوں تھی؟"

میں خاموش رہی۔

قادرا پانی پلانے آیا تو دادی اماں نے پوچھا "بستر لگا دیئے؟ انور کا بستر کہاں

لگایا: رشید کے ہاں؟ بس ٹھیک ہے!"

مرزا صاحب بولے "لیکن انور کی ایک عجیب عادت ہے۔ سونے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ پڑھنا ضرور ہے۔ ورنہ ساری رات کروٹیں لیتے گزر جاتی ہے، رشید! تمہارے ہاں کوئی ادبی رسالہ ہوگا؟ اسے دے دینا کہ وقت کاٹ سکے۔"

رشید بھائی سائنس کے طالب علم تھے۔ انہیں ادب سے کیا لگاؤ! آپا جان الگ مادہ پرست تھیں اور ایسے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو روحانی عیاشی کہکر پکارتی تھیں مگر میرے ہاں ہندوستان کے سب اچھے پرچے آتے تھے۔ دادی اماں نے جھٹ میری طرف دیکھا اور بولیں "انوری! وہ جو ہر مہینے تمہارے پاس نئی نئی کتابیں آتی ہیں وہی لا دے نا بھیا کو۔ جا بھاگ کر جا!"

میں اپنے کمرے میں جاکر رسائل کی چند فائلیں اٹھا لائی اور انور کے آگے دھریں اور انور نے مسکراتے ہوئے پوچھا "خود بھی کچھ لکھتی ہو انوری بہن؟"

میں بولی "نہیں، میں اس مرض میں مبتلا نہیں۔"

"مرض؟"

"ہاں شعر کہنا۔ افسانہ لکھنا۔ یہ بھی ایک قسم کا دماغی تپ دق ہے۔"

انور متعجب ہو کر بولا "لیکن آخر یہ پرچے کیوں منگاتی ہو تم؟"

"جی بہلا دے کے لئے! بیکار دل کی پریشان خیالیوں سے محفوظ ہونے کیلئے"

انور کچھ گھبرا سا گیا اور میں خوش تھی کہ انور پہلے وار میں ہی مجھ سے شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مرزا صاحب بھی میری تائید میں زور سے ہنسے لیکن ان کی ہنسی نے کھانسی کی شکل اختیار کر لی اور ہم اس موضوع سے ہٹ کر کھانسی کے

موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ لیکن میں دیکھتی رہی کہ انور کی ہر حرکت اس تعجب کا اظہار کر رہی ہے کہ کیا شعر کہنا اور افسانے لکھنا واقعی دماغی تپ دِق کی علامتیں ہیں اور کیا دماغی تپ دِق واقعی کوئی بیماری ہے اور کیا وُہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہے!

جب ہم سونے کے لئے اُٹھے تو انور نے رشید کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"بہت شوخ ہے انوری۔"

"شاعرہ ہے نا!"

"شاعرہ ہے!"

"ہاں، شاعرہ ہے!"

"شعر کہتی ہے؟"

"ہاں خود شعر کہتی ہے!"

انور کا مُنہ تعجب سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وُہ میری طرف پاگلوں کی طرح دیکھنے لگا اور میں بے اختیار ہنستی ہوئی سیڑھیوں پر اُڑتی ہوئی اپنے پلنگ پر آ کر دھم سے گر گئی۔ میں نے انور کو خوب بنایا تھا۔

ایک روز آپا جان دادی اماں کے پاس بیٹھی تھیں۔ بھیا رشید کالج گئے ہوئے تھے۔ رشیدہ ہماری خدمتگار نرگس سے کروشیا کے متعلق باتیں کر رہی تھی اور میں ایک چیونٹی کا مرثیہ لکھ رہی تھی جو اپنے ننھے سے مُنہ میں باجرے کا ایک دانہ دبائے اپنے سوراخ کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ میرے پاؤں تلے آ کر کچلی گئی اور دانہ ایک اور چیونٹی اڑا کر چلتی بنی۔ مجھے اس قسم کے معمولی واقعات کئی بار پیش آ چکے تھے۔

لیکن آج تو جیسے کسی نے میرے دل میں کسی بہت پرانے زخم کے نازک انگور کھرچ ڈالے ہیں مجھے سامنے چیونٹیوں کے سوراخ میں اس کی بہنوں، بیٹیوں اور سہیلیوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

اتنے میں میرے کمرے کے دروازہ کے سامنے سے انور گزرا۔ میرے سامنے دوات، کاغذ دیکھ کر ٹھٹکا اور باہر ہی سے بولا "کوئی نظم کہہ رہی ہو انوری؟"

"ہاں"

"کیا موضوع ہے؟"

"وہی شاعری کا رسوائے عالم موضوع، شمع و پروانہ، گل و بلبل، اس موضوع کے سوا آخر شاعری ایسے نازک فن میں اور رکھا ہی کیا سکتا ہے؟"

انور کچھ حیران سا ہو گیا۔ میرا طرزِ گفتگو طنزیہ رنگ لئے ہوئے تھا۔ بولا "اجازت ہے؛ آجاؤں اندر؟"

"ضرور!"

ہم بہت دیر تک اردو شاعری کے موجودہ دل پسند رجحانات پر گفتگو کرتے رہے لیکن اس گفتگو کے پردے میں دبی دبی آواز میں ہم دونوں نے کوئی ایسی بات بھی کہہ دی جس نے میرے دل کے سوئے ہوئے تاروں کو ایک دم جھنجھنا دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین میرے قدموں تلے سے کھسک گئی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ گیا ہے اور میں فضا کی لامحدود وسعتوں میں کسی ایسی منزل کی طرف اڑی جا رہی ہوں جو کائنات میں کہیں موجود نہیں۔

انور میرے پاس سے اٹھا تو جاتے ہوئے گنگنایا۔ ع

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

رشید کس رشتہ کی طرف اشارہ کر گیا! میں دیر تک سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سوچ کا انجام بھی ایک گہری سوچ ہے بے معنی اور بے ہنگم سوچ!

مرزا صاحب ایک ہفتہ ہمارے ہاں رہے۔ ان دنوں ہم سب کی زندگی کے مروجہ نظام میں بہت تبدیلی واقع ہو گئی۔ جیا رشید مجھے گھنٹوں نظر نہ آتے تھے۔ آپا جان اکثر مرزا صاحب اور دادی اماں کے پاس بیٹھی رہتی تھیں اور جب کبھی ادھر انور بھی آنکلتا، تو وہ دوپٹے کو کھسکا کر ماتھے پہ لے آتیں اور اس کی طرف —— لیکن مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے۔

رشیدہ کو دیکھنے کی میں بہت مشتاق رہتی تھی کیونکہ وہ بہت حسین تھی اور اس کی آنکھیں اتنی صاف تھیں جیسے کوثر سے بھری ہوئی شفاف کٹوریاں ہوں اور اس کے ہونٹ اتنے نازک تھے جیسے شبنم سے بھیگی ہوئی گلاب کی دو شگفتہ کلیاں، وہ بھی اکثر مجھے نظر نہ آتی تھی۔ جب کبھی ملتی اور میں پوچھتی کہ بہن کدھر بیٹھی رہیں تو جواب دیتی نرگس کے پاس، حالانکہ نرگس میرے سامنے ہی سودا خریدنے چلی جایا کرتی تھی اور بہت دیر کے بعد واپس آتی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس گھر کا ہر فرد مجھ سے کترانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آخر اس کی وجہ؟ —— راتوں کو اپنے چوڑے پلنگ پہ لیٹ کر میں بہت دیر تک اس کی وجہ سوچتی رہتی لیکن مجھے اس کے سوا کچھ نہ سوجھتا کہ کسی نے مجھے انور کے ساتھ شاعرانہ باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے سب مجھ سے بدگمان نظر آ رہے ہیں۔ دادی اماں بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔

لیکن اس کی وجہ مجھے نرگس کی زبانی بعد میں معلوم ہو ہی گئی کہ انہوں نے "مانو" کے گودام میں بھو کا پیا سا بند ہو جانے کو بہت برا مانا تھا۔

آخر مرزا صاحب کے کوچ کا وقت آپہنچا۔ چار بجے گاڑی کانپور کی طرف چھوٹتی تھی۔ دن بھر تیاریاں ہوتی رہیں۔ دادی اماں نے لاہور کے مختلف تحفے ننھی ننھی ٹوکریوں میں بند کر کے مرزا صاحب کے سامنے پیش کئے۔ مرزا صاحب نے بہت انکار کیا اور کہا۔ "ہم ماتم پر آئے ہیں۔ کوئی خوشی کا موقعہ تو ہے نہیں کہ تحفوں سے لد کر جائیں۔" لیکن دادی اماں برابر یہی کہتی رہیں کہ "تم میرے اکرم علی کی یادگار ہو۔ میں تمہارے بشرے میں اکرم بیٹے کا عکس دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے" —— حقیقت میں دادی اماں اس پیرانہ سالی میں بھی خاندانی وضع داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنی تھیں۔

جب موٹر تیار ہو گئی۔ اسباب وغیرہ باندھ لیا گیا تو میں بھاگ کر اپنے کمرے سے ایک کتاب اٹھا لائی اور انور کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "امید ہے آپ یہ کتاب بہت پسند کریں گے۔ بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ انہیں ضرور پڑھیے گا" میں کہنا چاہتی تھی کہ اس میں ان غمزدہ کشمیری لڑکیوں کی داستانیں ہیں جن سے محبت کی گئی اور جن سے محبت کرنے والے ناکام رہے یا بیوفا نکلے۔ اس میں ان خوشگوار لمحوں کی نقاشیاں ہیں۔ جب کشمیری لڑکیاں ٹھنڈے جھرنوں میں اپنے منہ ہاتھ دھو کر، اور سیبوں کے سفید پھولوں سے اپنی گھنی سیاہ زلفیں سجا کر اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھ کر گنگنایا کرتی ہیں ؎

کیوں اتنی دیر لگائی ۔۔۔ اب پو پھٹنے کو آئی

لیکن میں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ادھر رشیدہ نے اپنا بیگ

کھول کر ایک کتاب نکالی اور رشید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے آپ ضرور پڑھیے گا!" خدا جانے وہ کونسی کتاب تھی اور اس میں کیا لکھا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری کتاب ایک اور روپ دھار کر میرے بھائی رشید کی انگلیوں میں کانپ رہی ہے —— کانپ رہی ہے —— پیہم کانپ رہی ہے۔

سب موٹر میں بیٹھ گئے، دادی اماں، آپا جان، رشید بھیا اور میں پھاٹک پر اداس کھڑے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ روؤں۔ اس قدر روؤں کہ میرے آنسوؤں سے موٹر کا انجن تر بتر ہو جائے اور موٹر گھنٹوں یہیں کھڑی رہے۔ اتنے میں دروازے کے پیچھے سے مانو نے اپنا مربع شکل کا سر نکالا اور زور سے پکاری "میاؤں!"

دادی اماں کے اچانک جیسے کسی نے گولی ماردی بلبلا اٹھیں۔ میں بھی بھری بڑی تھی۔ کسی قسم کی کوشش کئے بغیر میں نے رونا شروع کر دیا اور آن کی آن میں آنسو میرے رخساروں سے ڈھلک کر میری ٹھوڑی پر اکٹھے ہوئے اور میرے سینے پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے پلٹ کر آپا جان اور رشید کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ میرا پراگندہ دماغ گھومنے لگا۔ تھوک نگل کر آنکھیں بھگونے والے آج تو ایک اشارے کے منتظر بیٹھے تھے۔ میں نے موٹر کی طرف دیکھا۔ انور میری طرف غمگین انداز سے دیکھ رہا تھا اور آپا جان —— لیکن مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے۔

اور جب موٹر گھرر گھرر کرتی ہوئی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو میں نے دیکھا کہ رشیدہ موٹر کے عقبی شیشے سے دو ڈبڈبائی آنکھیں ایک طرف بکمال حسرت و یاس گاڑے جھانک رہی ہے۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ رشید بھیا سسکیاں بھر رہے تھے۔

اور دادی اماں؟ ——— دادی اماں مانو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ کیا یہ سب مانو کی دردناک میاؤں کا اثر ہے یا...... لیکن خدا جانے انھوں نے اور کیا سوچا۔

سُرخ ٹوپی

اُس نے کپڑا نچوڑ کر الگنی پر لٹکایا اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوّے کو دیکھ کر بولی "تو جل مرے موئے کالے کلوٹے بھتنے، کائیں کائیں سے میرا مغز چاٹ لیتا ہے۔ گاؤں بھر میں کیا یہی منڈیر اچھی لگتی ہے تجھے؟" اور اُس نے اپنا پُرانا جوتا پوری قوت سے منڈیر پر پھینکا۔ کوا کائیں کائیں کرتا پھڑپھڑاتا اُوپر اُٹھ گیا اور پھر نمبردار کے بالاخانے کا چکر کاٹ کر اس دوسرے کی طرف اڑ گیا۔ جدھر سے گاؤں کے نوجوان جو فوج اور پولیس پر لازم تھے۔ اپنے بڑے بڑے بستر کاندھوں پر دھرے اور ہاتھوں میں جلیبیوں اور پیڑوں کی پوٹلیاں لٹکائے سال سال بھر بعد اپنی ماؤں بہنوں اور خدا جانے کس کس سے ملنے آتے ہیں۔

ایک اور کوّا اڑتا ہوا آیا اور منڈیر کی بجائے الگنی پر بیٹھ گیا۔ دو ایک بار جھولا

تو دیوار میں دھنسی ہوئی چیڑ کی کمزور کیل ڈھیلی ہو گئی، باہر کھسکی اور الگنی کپڑے سمیت زمین پر آ رہی، کوا نمبردار کے بالاخانے کا چکر کاٹ کر اسی درے کی طرف اڑ گیا۔

اُس نے کوّے کی بارہ پشتوں کو ایسے ایسے خطاب دیئے کہ پڑوسنیں چھتوں پر چڑھ آئیں۔ ادھیڑ عمر کی ایک بنی ٹھنی بیوہ ناک پر انگلی رکھ کر بولی "ہے ہے کیا غضب ہو گیا! کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ کوّے نے الگنی گرا دی؟ قربان جاؤں، میں سمجھی بہو رانی کو بچھو نے کاٹ لیا۔ اے یہ کوّوں کی کائیں کائیں تو بہت اچھا شگون ہے۔ یاد رکھ، تیرا سپاہی آج کل آیا کہ آیا۔"

"اُسے چھٹی نہیں ملنے کی۔ وہ ابھی رنگروٹ ہے!" اُس نے گرد آلود کپڑے کو صابن کے میلے جھاگ میں بھگوتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا دل پکار رہا تھا: "پگلی، رنگروٹوں کو بھی چھٹی مل سکتی ہے اور وہ تو اب رنگروٹی پاس کر چکا ہوگا۔" اور جب اُس نے اس درّے کی طرف دیکھا۔ جہاں ابھی تک ایک کوا منڈلا رہا تھا تو اُسے لہراتی ہوئی پتھریلی پگڈنڈی پر ایک نوجوان نظر آیا جس کے سر پہ ہاتھ بھر لمبا طرّہ تھا اور جس کی پگڑی کا رنگ گہرا نارنجی تھا جس کی مونچھیں بچھو کے تنے ہوئے ڈنگ کی طرح سرخ گالوں پہ کنڈلی مارے بیٹھی تھیں اور جس کے کپڑوں سے شوں شاں کی آوازیں آتی تھیں جس کے ہاتھ میں گلابی ریشم کا ایک بہت بڑا رومال تھا۔ اور کانوں میں عطر کی پھریریاں۔ درّے کی ہوا اس کے وجود سے عطر کی لپٹیں اڑاتی اس کے گھر پر منڈلانے لگی۔ وہ صابن کے میلے جھاگ کے برتن میں ہاتھ ڈالے اوپر فضا کی وسیع خلا میں گھورنے لگی۔ اچانک ایک کوا "سائیں" سے اس کے صحن پر تیر کی طرح گذر گیا اور اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کپڑے کو دھونا

ہاتھوں سے نچوڑنے اور مروڑتے ہوئے کہا: "غارت ہوجائے ان موئے کوؤں کی نسل دُھلا دُھلایا کپڑا خراب کرڈالا۔ موئے خدی بہ تحمیل!"

ان مختصر میٹھے خوابوں میں بسنے والی مہری اس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ کوئی دس مہینے ہوئے اس کی شادی ہوئی تھی۔ گاموں کو اس نے اس شادی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا، پندرہ بیس دن اکٹھے گذارے کھل کر بات کی نوبت ہی نہ آئی۔ ہر بات میں جھینپ اور ہر حرکت میں حجاب، وہ پانی مانگتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے یونہیں میٹھے میٹھے کسی گیت کا ایک بول گنگنا دیا! اور وہ بات کرتا تو جیسے شہد کی مکھی کسی شیشے کے مرتبان میں بھنبھنا رہی ہے!

اور جس روز ان کے گاؤں میں بڑا صاحب آیا۔ اور گاموں کے ابھرے ہوئے پٹھوں، چوڑے چکلے سینے اور گٹھے ہوئے جسم کو دیکھ کر بولا: "ول تم لوگ اچّا جوان ہے" تو اس روز مہری اپنی اچھی اچھی سہیلیوں سے بھی نہ بولی! اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ ان چھوکریوں سے بہت بلند ہے۔ جن کے گھر والے یا تو شہروں میں مزدوریاں کرتے ہیں یا کھیتوں میں دن بھر ہل چلاتے ہیں اور رات گئے گھر آکر سوکھی روٹیاں نگل کر اور کھاٹوں پر دراز ہوکر ایسے ایسے وحشت ناک خراٹے بھرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہوائی جہازوں کا ایک غول گڑگڑاتا جا رہا ہے!

اس روز گاموں کی گردن بھی کچھ اکڑ سی گئی اور چوپال پر سرحدی حقے پر لپٹے ہوئے میلے چیتھڑوں کو چھو کر بولا: "مجھے شرم آتی ہے ایسا غلیظ حقہ پیتے ہوئے۔" اور چوپال والوں نے اسے یہ اعتراض کرنے میں حق بجانب سمجھا۔ کیونکہ گوری جلد والے صاحب نے اس کی جسمانی صحت کو بہت سراہا تھا اور پھر اس نے گاموں سے جس گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس سے سب لوگ واقف تھے۔ حتیٰ کہ وہ لڑکیاں بھی واقف تھیں جو جھٹوں

پر منڈیر دل کی اُڑ لئے صاحب بہادر کو گھور تی رہی تھیں!

مہری کو جہیز میں ایک بھی ریشمی کپڑا نہ ملا تھا اور اس کے ماتھے کی مہر اور کانوں کے آویزے جو تانبے کے بنے ہوئے تھے، شادی کے دوسرے ہی دن اپنی چمک کھو بیٹھے۔ لیکن جب گاموں فوج میں ملازم ہو گیا تو مہری کو پڑوسن کی سونے کی مُہر اور جھمکے دیکھ کر کوئی خلش نہ ہوئی اور اس نے کئی بار محسوس کیا جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے اس کی تانبے کی مہر کو سونے کی مہر میں بدل دیا ہے اور جیسے اُس کے گلے میں ویسی چھینٹ کا چولا نہیں بدلیشی ریشم کی قمیض ہے جو صابن کے جھاگ کی طرح مہین اور اس کی سانولی جلد کی طرح نرم ہے!

شادی کے پندرھویں روز جب گاموں اپنے بیاہ کے رنگین بکس سے کپڑے نکال رہا تھا اور مہری اس کے لئے ایک ریشمی توشک کے انتخاب میں مصروف تھی جسے چھو کر اس کے سپاہی بھائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو چھت پر ادھیڑ عمر کی بیوہ پڑوسن نمودار ہوئی۔ آج اُس نے سُرخ ریشم کی قمیض پہن رکھی تھی جس کے حاشیے پر سبز ململ ٹکی ہوئی تھی اور اُس کے کانوں میں سونے کے جھمکوں کے سروں پر دو ننھے موتی بھی چھم چھم ناچ رہے تھے۔ جیسے اوس کے دو قطرے پھولوں پر پڑے کانپ رہے ہوں۔ مہری اُسے دیکھ کر پل بھر کے لئے جل اُٹھی مگر دراز قد گاموں کی چوڑی پیٹھ اور تیزی سے حرکت کرتے ہوئے بازو دیکھے تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے کچے گھر کے صحن میں نئے بادشاہ کے چمکتے دمکتے روپوں کی چھن چھن بارش ہو رہی ہے!

دن ڈھلے گاموں گاؤں سے باہر نکلا، تو اُس کے پیچھے نوجوانوں کا ایک انبوہ تھا بوڑھا نائی گاموں کا بہت بڑا بستر اٹھائے قدم قدم پر نتھنوں میں نسوار چڑھاتا سب کے

پیچھے رینگتا جا رہا تھا اور جب سب نوجوان گاؤں سے ایک میل دور ورّے سے گذر کر ایک طرف مُڑ گئے تو پڑوسنیں گردنیں بڑھا بڑھا کر چلّائیں "ہے ہے بھورا فی۔ کیا ٹک ٹک گھور رہی ہے اپنے دولہا کو، کیا چوپٹ زمانہ آیا ہے! ہم نے وُہ دن بھی دیکھے ہیں جب دولہا مر رہا تھا اور دلہن لجاتی ہوئی کونے میں سمٹی بیٹھی تھی اور یہ دن بھی دیکھا کہ دلہن چھت پر بیٹھی اپنے دولہا کو یوں گھور رہی ہے، جیسے یہ کوئی طوطا تھا کہ پنجرے سے نکل کر اُڑ گیا اور پھر واپس نہ آئے گا!"

اور جھری کا ندھے جھٹکاتی اُٹھی تیوری چڑھا کر آنچل کو سینے پر پھیلایا اور سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے بولی "خالہ جی۔ مَیں اُسے نہ دیکھوں تو کسے دیکھوں، مَیں دوسری لڑکیوں کی طرح گلیوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لونڈوں کو تو تانکنے جھانکنے سی ہی!"

اور بیوہ پڑوسن اپنی دونوں نوجوان بیٹیوں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "کیا منہ پھٹ ہے!" اور دونوں نوجوان بیٹیاں ہاتھ نچا نچا کر کہنے لگیں "آٹھ دس دن اکیلی رہی تو سب نشے ہرن ہو جائیں گے!" پڑوسنیں ہنس دیں اور جھری نے نیچے اُتر کر گاموں کے پرانے جوتے اور چپل جھٹک کر ایک پھٹی پرانی بوری میں رکھ دیئے۔ تمباکو کا برتن ایک چنگیر سے ڈھانپ کر اوپر ایک بکس پر دھر دیا اور حقّے کا پانی انڈیل کر اُسے ایک کونے میں اٹکا دیا۔ کھاٹ باہر نکال کر بیٹھ گئی۔ جب شام ہوئی اور قریب ہی مسجد سے بوڑھے مولوی جی نے سریلی آواز میں آذان دی تو غیرارادی طور پر اُس کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔ جہاں گاموں نماز کے بعد نمودار ہوتا تھا اور دکھا تا کہ کہتا تھا: "ذرا چپال پر ہو آؤں۔" ـــــ "ہو آؤ" وہ جواب دیتی اور پھر اندھیری رات کی چپ چاپ میں واپس آ کر جھری کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا ـــــ "پانی پلا دینا ذرا۔"

اور وہ ایلومینیم کا کٹورا اٹھا کر اس میں پانی ڈالتے ہوئے کہتی "کہو تو شکر ڈال دوں؟"

یہ سن کر گاموں کا رنگ سرخ ہو جاتا۔ اس کی رگوں میں تھرتھراہٹ دوڑ جاتی اور گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیتا۔ "ڈال دے۔"

کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکی رہتی تھی جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند ستارے کا نشان بھی تھا۔ ایک روز مہری نے گاموں سے پوچھ ہی لیا کہ "یہ ٹوپی کس کی ہے؟ کون پہنتا ہے؟ یہاں کیوں لٹک رہی ہے؟" اور گاموں نے جواب دیا۔ "یہ ایک بہت اچھے زمانے کی یاد دلاتی ہے مجھے کچھ سال گزرے ہمارے ملک پر ایک بہت اچھا وقت آیا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اکٹھے جلسے ہوتے تھے۔ اکٹھے بیٹھتے تھے کئی بار اکٹھے کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ میں ان دنوں بچہ ہی تھا لیکن آبا مجھے بتایا کرتے تھے کہ اس زمانے کو خلافت کا زمانہ کہتے ہیں۔ آبا قصبے سے گتا خرید لائے اور اس پر سرخ کھدر چڑھا کر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارہ ٹانک کر یہ ٹوپی بنائی اور میرے سر پہ رکھ دی۔ آبا اور گاؤں کے دوسرے بزرگ لمبے لمبے جھنڈے ——— کاندھوں پر رکھے گلیوں کے چکر کاٹتے اور ہم بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چلتے اور گایا کرتے تھے ؎

اَنتَ الھَادِی اَنتَ الحَق
لَیسَ الھَادِی اِلاَّ ھُو...

اور جب مہری نے گاموں سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ تو وہ نہایت باوقار آواز میں بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہ کرو، سچ بولو، نمازیں پڑھا کرو اور بڑوں

کا ادب کرو۔"

مہری پر گاموں کی علمیت کا بھی بہت زیادہ رعب پڑ گیا تھا۔ گاموں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ ابا کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور چھ مہینے وہ جیل میں چکی پیستے رہے۔ واپس آئے تو بیمار تھے۔ چارپائی سے لگ گئے اور آخر چل بسے۔ اگر ہمارے نمبردار جی سے اُن کی دشمنی نہ ہوتی تو اُنہیں کون قید کرتا۔ وہ تو بس "انت الہادی انت الحق" زور زور سے گایا کرتے تھے۔ سرکار کے خلاف اُنہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ یہ سُرخ ٹوپی ان دنوں کی نشانی ہے۔ پڑی رہے کبھی کام آئے گی۔"

اور گاموں کے چلے جانے کے بعد جب کبھی مہری کی نظریں اس ٹوپی پر پڑتیں، تو وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر اور کلائیوں میں کنگن گھما گھما کر سوچا کرتی کہ کس کام آئے گی یہ ٹوپی؟ کون پہنے گا اسے؟ اور سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ گاموں نے جو بے مطلب ایک لفظ تک مُنہ سے نہیں نکالتا، یہ بہت بے مطلب بات کہی۔

آٹھ دس مہینے گذر گئے اور اُس نے سُن رکھا تھا کہ سال کے بعد سپاہیوں کو چھٹی ملتی ہے۔ پچھلے چند دنوں سے ایک کوّا بلاناغہ اُس کے مکان کی منڈیر پر بیٹھ کر اس زور سے چیختا رہتا کہ اُس کی دُم ہر "کائیں" کے ساتھ جھک کر زمین کو چھو لیتی تھی اور ننھے بچے چونک کر بلبلا اُٹھتے۔ پڑوسنیں جی ہی جی میں کڑھتیں کہ کوّے کا مکان کی منڈیر پر بیٹھنا اُن کے نزدیک بہت اچھا شگون تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مہری اچھے دن دیکھے۔ کیونکہ وہ ذرا مُنہ پھٹ تھی اور بات کرتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ اس کی مخاطب کے بدن پر ریشمی قمیض ہے اور کانوں میں سنہری جھمکے!

ان آٹھ دس مہینوں میں گاموں کی دو چٹھیاں بھی آئیں جن میں اُس نے لکھا کہ

"ہم دن بھر دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ ہماری چھاؤنیاں بہت بڑے بڑے شہر ہیں۔ جہاں کی صفائی مسجدوں کے صحنوں کی سی ہے ہمیں صبح کو دال اور شام کو گوشت ملتا ہے یہاں میرا ایک دوست ہے جس کے وطن میں لنگیاں بہت اچھی بُنی جاتی ہیں۔ میں تمہارے لئے ایک لنگی ضرور لاؤں گا۔ افسر لوگ عام طور پر شہر نہیں جانے دیتے۔ عید کے روز ہمیں چھٹی تھی۔ میں شہر گیا تو ایک دوکان پر ایسے ایسے خوبصورت جھمکے دیکھے کہ تم پہن لو تو الف لیلہ کی لال پری دِکھنے لگو۔ یہاں کپڑا اتنا سستا ملتا ہے اور تمہاری ریشمی قمیص صرف ڈیڑھ روپے میں بن سکتی ہے۔ میں تمہارے لئے چار قمیصیں لے آؤں گا اور تم اُداس نہ رہا کرو۔ نمازیں پڑھا کرو۔ قرآن شریف پڑھ سکتی ہو تو صبح کو ضرور پڑھا کرو۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔ یہاں مجھے ایک خوبصورت قرآن پاک ملا ہے جس کی جلد چمڑے کی ہے اور جس کے صفحوں کے ارد گرد بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ مکان کی لپائی کی ضرورت ہو تو کرا لینا۔ رقم میں آکر ادا کر دوں گا اور باقی سب خیریت ہے۔"

اس قسم کی دو چٹھیاں جہری کو پہنچیں اور گو وہ قرآن پاک کے سوا اور کچھ نہ پڑھ سکتی تھی، لیکن گاؤں کے مولوی جی نے جو بیک وقت مدرسے کے اوّل مدرس، مسجد کے امام اور برانچ پوسٹ ماسٹر تھے۔ اسے جو کچھ پڑھ کر سُنایا، اُس نے اپنے دماغ میں محفوظ کر لیا۔ اُس نے کسی کے آگے ان چٹھیوں کی بات تک نہ کی۔ لیکن عام لوگوں کی زبان سے اُس نے اپنے پردیسی سپاہی کے خط کے الفاظ سُنے تو اُسے مولوی جی پر بہت غصہ آیا اور یہ سُن کر تو اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ نمبردار جی کل چوپال پر بیٹھے کہہ رہے تھے کہ گاموں بڑا بدمعاش ہے۔ ریشمی قمیصوں اور سنہرے جھمکوں کی باتیں بدمعاش ہی خطوں میں لکھا کرتے ہیں اور جہری نمبردار کی ان باتوں کا مطلب

نہ سمجھی لیکن وہ ساری رات جاگتی رہی اور صبح اُٹھ کر کپڑے دھونے بیٹھی تو کوّے نے اسے اس قدر تنگ کیا کہ اس پر اپنا پرانا جوتے پھینکنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑی!

بھلا ہو بوڑھی نائن کا وہ ہر ہفتے مہری کے ہاں جاتی اور اسے نون مرچ تیل اور صابن گاؤں کی دوکانوں سے خرید کر دے جاتی اور پچھلے چند دنوں سے تو وہ بلاناغہ مہری کے پاس آنے جانے لگی تھی، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی اور کہتی "اتنی بڑی بڑی چیزیں نہ اُٹھایا کر بیٹی۔ یہ اچھا نہیں ہوتا"

اور پھر ایک ہفتہ بعد مہری کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ چاند سا چہرہ دیکھ کر اسے اپنا گاموں یاد آ گیا جو چھاؤنی کے بڑے بڑے سکروں میں دنیا کے اتنے بڑے واقعہ سے بے خبر گھومتا پھر رہا ہوگا! اس نے نائن کو چار پیسے دے کر گاموں کے نام ایک چٹھی لکھوائی کہ ننھے کا کیا نام رکھا جائے!

جب نائن اس کے پاس بیٹھی ایک سیپی میں ننھے کے لئے دوا تیار کر رہی تھی، تو مہری کی نظر سُرخ ٹوپی پر جا پڑی جس پر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارا چمک رہا تھا۔ اور پھر اس کے پہلو میں ننھا رونے لگا اور اچانک اسے ٹوپی کا مصرف معلوم ہو گیا وہ جی ہی جی میں بہت خوش ہوئی اور سوچتی رہی "میرا گاموں تو کوئی بے مطلب بات نہیں کرتا۔ میرے گاموں کی نظریں کتنی دُور پہنچتی ہیں!

اسی شام کو جب اس پر نیند کی مستی چھا رہی تھی اور نائن دیوار سے لگ کر اونگھ رہی تھی تو دروازہ کھلا اور گاموں ہانپتا ہانپتا اندر آیا۔ کاندھے سے بستر اتار کر زمین پر پٹخ دیا اور مہری کی طرف دیکھ کر بولا "یہ کیا بات ہے، بیمار تو نہیں ہو مہری؟"

مہری چونک پڑی۔ اس کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ وہ اس شدت سے لرزی

کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ننھا سوتے میں بلبلا اُٹھا۔ گاموں سب کچھ سمجھ گیا اور مسکرایا۔ لیکن یہ مسکراہٹ بہت بے رونق سی تھی!

بوڑھی نائن نے اُٹھ کر گاموں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے کاندھے کو اپنے "نسوار آلودہ" ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ کڑوے تیل کا دیا طاقچے میں دم بخود پڑا تھا اور سارے کمرے میں زرد زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑھیا بولی۔ "میرے لال تجھے لاکھ لاکھ مبارکیں۔ یوں بھی کوئی نوکری سے آتا ہے۔ نہ گز بھر لمبا طرّہ۔ نہ ریشمی قمیص۔ نہ گلابی لنگی۔ جیسے چوری چھپے کھسکتا ہوا گلیوں میں ادھر آنکلا۔ آخر یہ بھی کیا آنا ہوا۔" اور گاموں نے اپنا بستر کھول کر بڑھیا کو ایک کپڑا نکال دیا اور کہا "لے خالہ یہ تیری نذر" اور جب وہ بستر کو لپیٹ رہا تھا تو مہری نے ایک صراف سونے کے جھمکے، ریشمی قمیصیں اور رنگدار لنگیاں پڑی دیکھیں!

بوڑھی نائن گاموں کو دعائیں دیتی گھنٹہ بھر کے لئے گھر کو چلی گئی۔ گاموں مہری کے قریب گیا اور جھک کر بولا "مہری"! مہری کانپ اُٹھی! اور اپنے لرزتے ہاتھ بلند کر کے اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے بولی "کیسے پھولوں کی چھٹی ملی ہے"؟

گاموں نے ادھر اُدھر دیکھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مدھم آواز میں بولا "میرا نام کٹ گیا!"

باہر کوئی بھولا بھٹکا کوا ان کے مکان کی چھت پر سے کائیں کائیں کرتا گذر گیا!

مہری کے پہلو میں سویا ہوا ننھا بچہ سوتے میں اچانک کانپ کر رہ گیا۔ مہری پھٹی پھٹی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی بولی: "کس لئے"؟

وہ بولا "میں پکّا ہونے والا تھا۔ اس لئے میرے افسروں نے میرے چال چلن کے بارے میں نمبردار سے پوچھ بھیجا تھا۔ نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے، اس کا دادا

"انت الہادی انت الحق" پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر ابھی تک سُرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے جس پر چاند ستارے کا نشان ہے ـــــــ افسروں نے مجھے برخاست کر دیا ہے!"

مہری اسی طرح لیٹی رہی۔ اُس نے کوئی حرکت نہ کی اور جب گاموں نے جھمکے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیئے تو اُس نے اُنہیں چھوا تک بھی نہیں۔ بولی: "آج کل سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ جھمکے بِک جائیں تو کے دن بے فکری میں گذریں گے؟ اور شاید پہلی سلائی قمیصیں بھی کوئی خرید لے!"

گاموں بھونچکا سا رہ گیا۔ دیوار پر دوڑتی ہوئی ایک چھپکلی سُرخ ٹوپی سے ٹکرائی۔ اور ٹوپی گرد و غبار کا ایک مرغولہ اڑاتی گاموں کے قدموں میں آن گری! اور باہر اندھیرے میں کوئی بھولا بھٹکا کوّا کائیں کائیں کرتا نمبردار کے بالاخانے سے ٹکرا کر پھڑپھڑایا اور جانے کدھر اُڑ گیا۔

پرچھائیاں

سر پہ فولادی خود، بدن پر زرہ بکتر، نیزہ تانے، تلوار سجائے میں افق کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ میرے وطن کی فوجیں جا چکی تھیں اور مجھے اپنی بیمار محبوبہ کو تسلیاں دینے میں دیر ہو گئی تھی۔

ایک تنکا اڑتا ہوا آیا اور میری زرہ کی مہین جالی میں اٹک گیا۔ میلا میلا سا رنگ، کمزور اور ناتواں۔ عرصے کی کشمکش اور اضطراب کے بعد شاید سکون پا کر سونے ہی کو تھا کہ ایک اور تند جھونکا آیا۔ تنگ آکر اُس نے ایک کروٹ بدلی اور اُبھر کر میرے شانے سے چمٹ گیا اور بولا۔ "تم اس ویرانے میں کیوں بھٹک رہے ہو؟ یہاں تو وہی جنہوں پھرا کرتی ہیں۔ جن کے وجود سے کائنات کو کسی قسم کے فائدے کی امید نہ ہو۔ تم تو مجھے آدم کی اولاد معلوم ہوتے ہو، اور آدم کی اولاد کو آقا نے بڑی قوتیں دے رکھی ہیں۔

(کروٹ بدل کر) —— میں اگر آدم کے اُن فرزندوں کے نام گننے لگوں جنہوں نے مجھے توڑا مروڑا۔ روندا اور ٹھکرایا تو اسی میں تمہاری ساری عمر بیت جائے۔ آخر تم انسانوں کی عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تمہیں اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ کا لقب کس لئے دیا گیا ہے۔ میں تو تمہاری بے بضاعتی دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں! (کروٹ بدل کر) —— اسی ویرانے میں ایک روز بہت بڑی جنگ ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں ایک کُل کا جزو تھا میرا ایک بھائی کُل سے جُدا ہو کر اُڑتا ہوا ایک بہادر سپہ سالار کی گردن پر جا بیٹھا اور سپہ سالار نے جس کے ہاتھ کے اشارے سے میدان کا رنگ آن کی آن میں کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا۔ وحشیانہ انداز میں گھبرا کر اس زور سے اس پر ہاتھ مارا جیسے ہوا میں سے اُس پر اژدہا آن گرا ہے۔ زخمی جسموں کو تاڑنے والے اور خون کی ندیوں میں تیرنے والے اس اولوالعزم انسان کی روح میرے بھائی کے ذرا سے مس سے اس زور سے لرزی کہ وہ تھتھرانے کی کوشش میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر آ رہا۔ وہیں ایک گھمسان کا رن پڑا۔ اور وہ بیچارا وہیں منوں ریت کے نیچے دب کر رہ گیا۔ مدت کے بعد اپنے کُل سے جُدا ہو کر میرا بھی اُدھر سے گذر ہوا۔ ریت کے نیچے سے گھٹی گھٹی آواز آئی۔ بھئی اب میں یہاں پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ سُنا ہے یہاں ایسا طوفان کب آئیگا کہ مجھ پر سے یہ منوں ریت اُڑ جائے اور میں تمہیں گلے لگا لوں۔ میں اپنے ہمجنسوں کے لئے ترس گیا ہوں۔ یہاں تو ذرا ذرا سے ٹھنڈے اور گرم ذروں کے سوا ہے ہی کچھ نہیں اور یہ سب میرے کان میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے بول بولتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہم حقیر ذرے نہیں ہم ایک دنیا ہیں۔ ہم ایک جہان ہیں غیر فانی اور ابدی —— اور جب سورج زمین پر اُتر آئیگا۔ اور پہاڑ روئی کے گالے بن کر اُڑنے لگیں گے تو بھی ہم فنا نہیں ہوں گے،

ہم فضا بن جائیں گے۔ ہم اُس خلا میں بے آواز گھومتے پھریں گے جو نہ جانے کتنی وسیع اور کس قدر تنگ ہوگی۔" ـــــ بھئی مجھ سے یہ بڑے بول نہیں سُنے جاتے، کوئی نوید سُنا!" ـــــ میں ریت میں سر ڈال کر پکارا۔ "بے فکر پڑا رہ۔ کوئی دن میں تو پھر اپنے آپ کو نیلے آسمان اور بھوری زمین کے درمیان بسیط خلا میں چکر کاٹتے، ٹوٹتے، اُڑتے رقصاں پائے گا۔" ـــــ پوچھنے لگا "کیوں؟" میں نے جواب دیا۔ "ارے اب اس زمین پر مہابھارت اور پانی پت کی لڑائیوں کی یاد تازہ ہونے والی ہے نا! ـــــ جس طرح تو ریت کے بوجھ سے تھک گیا ہے، اسی طرح یہاں کے غلام بھی غلامی کی چٹانیں اپنی پیٹھ سے اتار کر پرے پھینکنے والے ہیں۔" ـــــ اور تنکا کروٹ بدل کر میرے شانے پر سے اڑا اور ایک سوکھی جھاڑی میں جا کر سو رہا!

سامنے آک کا ایک بوٹا تھا جس کے سائے میں اُس کے اپنے سوکھے پتے سو رہے تھے اور جس کے ایک مرجھائے ہوئے اُودے سے پھول پر ایک مکوڑا بیٹھا اپنی ننھی گول آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر پھر اڑا اور کمان کا سا خم کھا کر میرے قدموں میں آن گرا۔ سبز اور سُرخ پروں کو سمیٹتے ہوئے بولا: "کیا حال ہے دوست؟ تو مجھے نہیں جانتا لیکن میں تجھے جانتا ہوں۔ اس لیے کہ میں مکوڑا ہوں اور تو انسان ہے۔ تو عقل و خرد کا خزینہ اور میں ایک ناکارہ سی چیز۔ اس لیے تو مجھے بھول گیا ہے اور میں تجھے نہیں بھولا" ـــــ اُس نے ایک بار پھر پر پھول کر سمیٹے جیسے مجھ پر پھبتی کس رہا ہے اور اپنی لمبی مونچھوں کو ہلاتے ہوئے بولا: "مارے تو پرے کیوں کھسکا جا رہا ہے؟ میں انسان کے جسم پر بیٹھ جاؤں تو کیا قیامت نازل ہو جاتی ہے؟ تھرتھری سی دوڑ جاتی ہے تمہاری رگوں میں! تم شیر کے جبڑوں میں ہاتھ رکھ کر اُسے پھاڑ ڈالتے ہو، اور مجھ ننھے سے مکوڑے کی پتلی ٹانگوں کے مَس سے جھرجھری سی آ جاتی ہے تمہارے ہو۔ میں ابھی تک تمہاری فطرت نہ سمجھ سکا۔ مدتوں میں شہر کے قریب ایک آک پر آشیانہ بنائے بیٹھا

رہا اور آدم کی اولاد کی حرکات کو بغور دیکھتا رہا ——— اندھیری راتوں میں مجھے تمہاری فطرت کے مطالعہ کا خاص موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ تمہارے سائے دبے پاؤں خالی ہاتھ گلیوں میں گھستے ہیں اور پوٹلیاں اٹھائے باہر آ کر اندھیرے میں کھو جاتے ہیں! ——— کھڑکیاں کھلتی ہیں اور نازک جسم مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لئے جاتے ہیں! ——— کئی بار مجھے نیند آنے لگتی تھی کہ "کرچ" کی آواز آتی اور کسی معصوم کی روح سر دھنتی ہونٹ کاٹتی شدتِ غم و غصہ سے فضا میں کروٹیں بدلتی ستاروں کے دیس میں اڑ جاتی! ——— لمبی لمبی چمنیوں سے دھوئیں کے طوفان اٹھتے اور ہزاروں سیاہ فام انسانوں کی دبی دبی آہیں ان کے ساتھ لپٹی ہوئی فضائے بسیط میں گھل کر رہ جاتیں ——— لمبی لمبی شعلہ بار تقریریں ہوتیں ——— اور تقریریں کرنے والے خانقاہوں اور حجروں کی آڑ میں بے گھر دوشیزاؤں کی عصمتوں پر نفسانیت کی عفونتیں لپیٹ دیتے ——— بالاخانوں کی ایک قطار میں رنگین شیشوں والی کھڑکیاں کھلتیں خوبصورت جسم اپنے حسن و جمال کا عریاں مظاہرہ کرنے کے لئے آگے جھکتے سکوں کی کھنکھناہٹ سنائی دیتی اور انسانی روحیں روشن دانوں کے رستے نکل کر باہر منڈیروں پر بیٹھی سسکتی رہتیں اور کچھ دیر بعد پھر اندر جا کر پیٹتے اور دھڑکتے سینوں میں سما جاتیں! ——— ایک روز میں نے ان ڈھکی چھپی باتوں سے تنگ آ کر ایک چھلانگ لگائی اور ایک مسافر کی پگڑی پر آن بیٹھا جو شہر سے بیس میل دور اپنی محبوبہ کو ملنے جا رہا تھا۔ راہ میں اس نے ایک گیت گایا جس کا مفہوم یہ تھا۔ "اے میری پردیسی محبوبہ آ کسی پیپل کی گھنیری چھاؤں تلے بیٹھ کر الف لیلہ کی کہانیاں پڑھیں کیونکہ انسانوں کی کہانیوں میں فریب ہے اور جنوں پریوں اور دیوؤں کی داستانوں میں یہ بات نہیں۔ انسان اوپر سے مسکراتا ہے مگر اندر سے اس کے دل کے ناسور رِس رہے ہوتے ہیں۔ دکھ ظاہر ہوتا ہے مگر اس کی روح میں چھپی ہوئی بے شمار مسرتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ——— انسان ریاکار ہے۔ دیو اور جن سچے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ وہی کہتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو سراپا

ہونٹوں سے ہونٹ ملائے تو میری سب سے اونچی ٹہنی کی آخری پھننگ نے ستاروں کے دیس میں فرشتوں اور حوروں کے ایک جھمگٹ کو مسکراتے دیکھا۔ وہ جدا ہو گئے۔ میں نے غمزدہ ہو کر اُس روز بہت سے پتّے جھٹک دیئے۔ مدتوں مجھے اُن کا تصوّر ستاتا رہا۔ آندھیوں اور بگولوں نے مجھے اُن کی بے سر و پا خبریں سنائیں اور آخر ایک روز افق پر سے گرد و غبار اُٹھا۔ گرانڈیل سپاہی تلواریں تانے بڑھے اور اس دھرتی کے چپے چپے پر خون کی نہریں بہہ گئیں۔ وہ نوجوان ایک جرنیل کے لباس میں میرے سائے تلے سستانے بیٹھ گیا۔ اُس کی تلوار سے لہو ٹپک رہا تھا اور گٹھے ہوئے جسم سے خون آلود پسینہ۔ اچانک ایک جھونکے سے میرا سارا وجود کانپ گیا۔ سامنے وہی عورت ننھے سے مشکیزے سے زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی۔ وہ جرنیل کو دیکھ کر لپکی۔ میرے سائے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کے ہونٹ چومے اور کہے! تو سچ مان لے کہ اُس روز میں نے اس کرۂ خاکی کا دل دھک دھک کرتا سنا! ــــ وہ دونوں چنگھاڑتے ہوئے میدان سے اُڑتے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو گئے اور میں نے ایک آہ بھری ۔ ایک بگولا طیش میں ناچتا اُٹھا اور مرے ہوئے سپاہیوں کے خون آلود لبادے پھڑپھڑاتا افق کی طرف روشنی کے مینار کی سی شکل اختیار کرتا غائب ہو گیا ــ آنسوؤں کا نمکین ذائقہ بھی چکھا ہے خون کے قطروں کی گرم گرم چاشنی سے بھی لطف اندوز ہوا ہوں۔ خاموشیوں کی لذّت بھی اُٹھائی ہے۔ تلواروں کی جھنکار کا نغمہ بھی ابھی تک میرے بوڑھے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اب بہت ضعیف ہو چکا ہوں مگر اندھیری راتوں کو جب آندھیاں چلتی ہیں۔ تو میرے خول سے پھٹی پھٹی آواز میں ایک خوفناک گیت بلند ہوتا ہے ــ ایک انقلابی گیت ــ جسے تم سن لو تو افق کی طرف بھاگ جاؤ۔ جہاں آج کل بھارت ماتا کے سپوت اُس کی بیڑیاں کاٹ رہے ہیں ــ نوجوانوں کا گرم خون فولاد کیلئے تیزاب کا حکم رکھتا ہے۔ مدتیں گذریں کوئی بات سننے والا نہ ملا۔ تم نوجوانوں سے مجھے محبت ہے۔ تیری تلوار کو میں خاک اور خون میں لتھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ رخصت! ــــ اُس نے اپنے خول سے ایک تیز بھیانک نعرہ

بلند کیا۔ میں نے اُسے کمال عزت و احترام سے چھوا۔ اچانک میرے پہلو سے ایک بگولا اُٹھا اور خاکستری آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ میں آگے نکل گیا!

ایک سوکھی جھاڑی کی جڑوں میں ایک چڑیا چونچ کھولے خشخاش سی آنکھیں نکالے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا سفید سینہ سانسوں کے اُتار چڑھاؤ سے لرز رہا تھا۔ اُس نے گرمی کی شدت اور پیاس کی کوفت سے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور تمازت سے بچنے کے لئے کبھی کبھی ایک موٹی جڑ کے تلے سر دبانے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر بولی ..."جانے مجھے اب تم انسانوں سے کیوں ڈر لگتا ہے۔ خدا کیلئے میرے قریب نہ آنا۔ میں غریب ہول کر مر جاؤں گی" — میں حیران ہو کر بولا "آخر بات کیا ہے؟" کہنے لگی "میری بپتا سنو گے کیا؟ تم جانو چڑیا کی نسل اتنی نادان نہیں کہ پیٹ بھرنے کیلئے ریت کے سمندر میں بھٹکتی پھرے۔ بات یہ ہوئی کہ ان دنوں میں انڈے دے رہی تھی۔ میرا چڑا اکثر میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہتا۔ مجھے تسلیاں دیتا۔ اُٹھتے بیٹھتے میرا سہارا بنتا اور ریشم کھولا اس کی چونچ میری چونچ سے مَس کرتی تو میرے سارے دکھ درد کافور ہو جاتے — مدتوں ہم ایک ہی جگہ میں رہے کل اس گھر کا ایک نوجوان کہیں سے ایک چھپکری بیاہ کر لایا اور ہمارے کمرے میں دونوں پلنگ بچھا کر بیٹھ گئے۔ آج صبح میں نے ایک انڈا دیا تھا۔ اس لئے نقاہت سی تھی بدن میں۔ میرا چڑا میرے سر کے بالوں پر چونچ پھیر رہا تھا اور چوں چوں کرتا میرے ارد گرد گھوم گھام کر گاہے گاہے میرا مزاج پوچھ لیتا تھا۔ نیچے فرش پر نئے نئے میاں بیوی راز و نیاز میں مصروف تھے اور اور ہاں! میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ تم انسانوں کے راز و نیاز کا کوئی وقت تک مقرر نہیں۔ تم اتنے قوی سمجھے جاتے ہو اور عورت کو دیکھ کر تمہاری رگوں میں خون کے بجائے برفیلا پانی تیرنے لگتا ہے ہم چڑیوں کو دیکھو ہمارے چرچے ہیں۔ دانہ چگتے وقت کبھی تنگ نہ کریں گے یہاں تو ہمارا شور سن کر نئے نئے میاں بیوی بہت سٹپٹائے پہلے تو شی شی کرتے رہے جو تم قوی انسانوں کا ہم

کمزور چڑیوں کے خلاف پہلا حربہ ہے۔ دلہن نے کڑے بجائے، تالیاں پیٹیں۔ دولہا نے بازو جھٹک جھٹک کر ہمیں ڈرایا میرے چڑے نے کوئی پرواہ کی تو دولہا اپنا نیا جوتا اتارنے لگا۔ میں چلائی کہ "اِدھر کھسک آ، اِدھر میرے پہلو میں آجا" لیکن وہ وہیں بیٹھا مجھے ایک گیت سناتا رہا، پٹاخ سے جوتا ہمارے گھونسلے پر آن گرا اور میرے چڑے کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں سے اڑا اور میں دو انڈوں کو تنکوں تلے چھپاتی اس کے پیچھے ہولی لیکن وہ اس سے قبل میری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ سہیلیوں سے پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کراہتا ہوا اُدھر ویرانے کی طرف جا رہا تھا ۔ ایک پر لٹکا ہوا ۔ ایک ٹانگ جھولتی ہوئی ــــ خاموش اور بیہوش ــــ جیسے بہت با جرہ چگ لیا ہے۔ میں نے اِدھر کا رُخ کیا، اڑتے اڑتے پروں نے جواب دیدیا۔ انتڑیاں پیاس سے سوکھی ہوئی تھیں، ہانپ گئی، تھک گئی اور گھسٹتی گھسٹتی اس جھاڑی تلے آگئی لیکن اس جھلجھل میں میں ننھی سی جان کیسے جی سکوں گی سورج آگ برسا رہا ہے مر جاؤں گی لیکن مرنے سے پہلے ایک بہت لمبی اڑان کی تمنا ہے تم اِدھر کہاں آ نکلے۔ یہ رہ گذر تو کہیں ختم ہونے کا نہیں ــــ وہ دور ایک لکیر سی نظر آ رہی ہے نا ــــ وہاں ایک آبادی ہے" ــــ میں نے چھاگل کا منہ کھول کر چلو میں پانی بھرا اور چڑیا کے آگے لیجا کر بولا: "لے ذرا حلق تر کر لے اور بتا اب کدھر جائے گی؟" ــــ پانی دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور میرے پہلو میں پروں کو سمیٹتی اور پھیلاتی رہی۔ آنکھیں جھپکا کر بولی "تم انسان ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہو ــــ میں اُدھر اُفق کی طرف جاؤں گی میرا چڑا سیدھا اُدھر گیا ہے اور سُنا ہے افق پر جنگ ہو رہی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آگیا تو اُنجر پنجر تک نہ ملے گا، میں تو یہاں بھی تلواروں کی جھنکاریں اور تیروں کی سنسناہٹ سنتی ہوں تو جی بیٹھنے لگتا ہے ــــ لیکن حضرت انسان ــــ میرا چڑا تو مجھے آگ کی بھٹی میں بھی ملے تو میں اس میں کود جاؤں" ــــ ایک گیند کی مانند ــــ وُہ دور ایک

اُڑتا ہوا پتہ ۔۔۔ ایک بھورا سا ۔۔۔ دھوئیں کا ایک نقطہ سا ۔۔۔ اور پھر نظر سے اوجھل ۔۔۔ گمان سا ہُوا اور مٹ گیا ۔۔۔ اور ویرانے میں بہت دُور گھوڑوں کی ہنہناہٹ، سپاہیوں کے نعروں ۔ تلواروں کی جھنکاروں کی بہت مدھم گونج کے سوا اور کچھ نہ رہا!

کتنی دردمند دُنیا ہے! ۔۔۔ کتنے دُکھی ہیں یہاں کے بسنے والے! ۔۔۔ یہاں دلوں پر کتنے زخم ہیں اور ان زخموں کیلئے مرہم کی کتنی کمی ہے ۔۔۔ یہ کیسی دُنیا ہے، کتنے انوکھے قانون ہیں یہاں ۔۔۔ قدم قدم پر کتنی ہولناک داستانیں سُننے میں آتی ہیں ۔۔۔ دُنیا والوں نے خدا جانے سُکھ اور مسرت کے الفاظ کیسے گھڑ لیئے ہیں جب کائنات کے چپے چپے پر دکھوں کی بھیانک پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں ۔۔۔ احساسات کے دباؤ نے میری رگوں میں آگ بھر دی ۔۔۔ مجھے ہر طرف دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں، میں نے سمجھا یہ ایک واہمہ ہے ۔ لیکن میرے قدم جتنی تیزی سے اُٹھتے چیخیں تیز تر ہوتی جاتیں! ۔۔۔ میں سرپٹ دوڑنے لگا ۔ لیکن میں جیسے التجاؤں اور فریادوں، سسکیوں اور ہچکیوں کے طوفان کی طرف کھچا چلا جا رہا ہوں ۔۔۔ آوازیں تیز اور بلند ہوتی گئیں ۔۔۔ میرا دماغ وحشیانہ سرعت سے گھومنے لگا ۔۔۔ اور آخر ایک کھنڈر کی دیوار کے پاس جا کر میں ایک جگہ بے جان پتھر کی طرح گرم ریت پر دھب سے گر پڑا!

۔۔۔ لیکن چیخیں اُسی طرح بلند ہو رہی تھیں ۔۔۔ سُلگتی فضا میں ان فریادوں کی لپٹیں بل کھاتی ہوئی افق کے دائرے میں قیامت خیز سُرعت سے چکر کاٹ رہی تھیں! ساری کائنات ان چیخوں کی زنجیروں میں جکڑی گئی ۔ میرا دم گھٹنے لگا! ۔۔۔ اُچک کر کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی محراب پر چڑھ گیا ۔ اندر بڑی بڑی مونچھوں ۔ گھنی بھوؤں اور گول تونڈوں والے دو دیو ایک خوبصورت دیہقانی لڑکی کے بازو پکڑے اُسے ننگا کرنے کی کوشش کر رہے تھے!

۔۔۔ وُہ بے چاری بے بس ٹھڑی کی طرح سمٹ سمٹ جاتی تھی ۔ اُس کے چوڑھے کے